لوز

آمنہ اقبال احمد

لوفر

آمنہ اقبال احمد

ندیم پبلی کیشنز، کشمیری بازار راولپنڈی

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں۔

ناشر .... امانت ندیم

اشاعت اول .... فروری ۱۹۸۰ء

اشاعت دوم .... اگست ۱۹۸۹ء

اشاعت سوم .... مئی ۲۰۰۴ء

مطبع .... ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی۔

قیمت .... ۲۰۰ روپے

اس ناول کے نام۔ مقام کردار سب فرضی ہیں۔

نوفر

آمنہ اقبال احمد

ہماری
کتابیں
معیاری
کتابیں

انتساب

اقبال صاحب کے نام جن
کا تعاون اس کتاب کی
تخلیق کا باعث بنا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑیے

١

"ہیلو"۔ نمبر ڈائل کرکے وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

"فرمائیے"۔ ایک مشتعل، طنزیہ نسوانی آواز ابھری۔

"میں۔۔ میں۔۔۔" پل بھر کو وہ بوکھلا سا گیا۔

"کس سے بات کرنی ہے؟" وہی آواز تھی۔ کرخت، غضیلی۔

"وہ۔۔۔" اس نے بیچارگی سے ریسیور کو دیکھا۔ "وہ۔ مس۔۔۔۔ فصیح احمد سے۔۔۔۔؟"

"شٹ اپ"۔ مزید مشتعل چیخ نما آواز اس کے کان کے پردے کو چیرتی چلی گئی۔

"اوہ۔ میں۔۔۔ میرا نام۔۔۔" توہین کا شدید احساس ذہن پر لیئے وہ کہنے لگا۔۔۔۔۔

"آپ کا نام یوفر ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے"۔ لہجے میں شدید حقارت تھی۔ ساتھ ہی کھٹاک کے ساتھ ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔

ریسیور کان سے ہٹا کر وہ چند لمحے اُسے گھورتا رہا۔ پھر کریڈل پر ڈال کر بھاری سے قدم اُٹھاتا باہر کی طرف بڑھا۔

ایک نظر کوریڈور پر ڈالی۔ جہاں ٹیلیفون رکھا تھا۔ وہ کوریڈور کا آخری سرا تھا۔ کوریڈور کا یہ حصہ زیادہ چوڑا بالکنی نما اور شیشوں کی بڑی اور چوڑی کھڑکیوں سے آراستہ تھا۔ اسی میں ایک طرف بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا۔ اُس کے عین سامنے بیٹھنے کے لئے چھوٹی چمڑے کی گدے دار میز تھی۔

طویل و عریض کوریڈور میں قیمتی قالین بچھے تھے۔ اس میں کھلنے والے کمروں کے دروازے پرانی طرز کی صناعی کا نمونہ تھے۔ دروازوں پر بھاری قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ جابجا خوبصورت سٹینڈوں میں پیتل کے بڑے بڑے منقش گلدان رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بڑی بڑی نایاب قسم کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ اور چھت سے قدیم خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ باہر کھلنے والے دروازے تک آیا۔ قیمتی مخمل کا بھاری پردہ ایک طرف کھسکاتے ہوئے وہ بڑے سے بھاری قدیم طرز کے مگر بے حد خوبصورت کھدائی کے کام والے پیتل کی چمکتی ٹکڑیوں سے مرصع

دروازے سے باہر برآمدے میں نکل آیا۔

طویل و عریض برآمدے کا فرش بے حد شفاف اور خوبصورت محرابی ستون سنگِ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ سنگ مرمر ہی کی کئی چوڑی چوڑی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ نیچے بجری کی سڑک پر آ گیا۔

اس نے دیکھا سامنے ہی دور تک پھیلا وسیع اور خوبصورت لان تھا۔ صفائی سے کٹی ہوئی گھاس۔ جا بجا نایاب پھولوں کے تختے۔ خوبصورت روشیں جگہ جگہ سفید سنگ مرمر کے بنچ۔ دور ایک کونے میں مرمر کی بنی ہوئی چند کرسیاں درمیان میں میز اور ان پر سایہ کیے خوبصورت چھتری نما چھت تھی، لان کے عین وسط میں تالاب تھا اور اس کے شفاف نیلگوں پانیوں میں تیرتی جل پری پانی کے خوبصورت فوارے کو جنم دے رہی تھی۔

اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا۔ بجری کی سڑک اس کے قدموں تلے سے ہو کر کار پورٹ میں سے گزرتی مرمریں ستونوں والے برآمدے کے آگے سے ہوتی دور تک چلتی دائیں طرف مڑ کر پہاڑی کے دامن اور وسیع لان کے کنارے کے ساتھ ساتھ جاتی دور بہت بڑے اونچے آہنی گیٹ میں ختم ہوتی تھی۔ گیٹ سے ہٹ کر اس کی نظریں بجری کی سڑک کے ساتھ ساتھ ایستادہ پہاڑی پر گئیں۔ جیسے پتھر کی دور تک جاتی بل کھاتی سیڑھیاں دو حصوں میں بانٹے ہوئے تھیں۔ سیڑھیاں اوپر جا کر دو شاخوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ پہلی شاخ

مہمان خانے کو جاتی تھی۔

مہمان خانہ ـــــــ سفید سنگ مرمر کی خوبصورت دو رویہ عمارت ۔ اس طرح کہ نچلی قطار کے کمروں کی چھتیں اوپر والے کمروں کے لئے کھلے ٹیرس کا کام دے رہی تھیں۔ نچلے کمروں کی قطار کے آگے پہاڑی ہموار کر کے چھوٹا سا لان بنایا گیا تھا۔ ایک پتلی سی پتھریلی سیڑھیوں کی قطار اس مہمان خانے کو نیچے آہنی گیٹ سے ملاتی تھی۔

مہمان خانے کے اوپر پہاڑی کی چوٹی پہ سدا بہار پائینز میں گھرا گولائی میں بنا شیشوں کا چمکتا سن روم تھا۔

نظریں پھیر کر وہ سیڑھیوں کے اس طرف دیکھنے لگا۔ پہاڑی ڈھلان پہ اگلائے گئے سیب کے باغ کے درخت سرخی مائل ادھ پکے سیبوں کے بوجھ تلے جھکے جا رہے تھے۔ جا بجا پانی کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر انہی درختوں کے بیچوں بیچ چلتے نیچے کی طرف رواں دواں تھے۔

خوبصورت پلکیں جھپک کر اس نے گہری سانس لی۔

سیب کے درختوں سے گھری پہاڑی دائیں طرف چل کر ڈھلان کی شکل اختیار کرتے ہوئے محرابی برآمدے کے آخری سرے پر جا کر اچانک ہی ختم ہو گئی تھی۔

قدموں کے بل گھوم کر اس نے رخ واپس قدیم محل نما کوٹھی کی طرف موڑا۔ اس کے سامنے اب برآمدے کی وہی سیڑھیاں تھیں۔ جن سے اتر کر وہ ابھی ابھی

بجری کی اس سڑک پر آیا تھا۔

طویل و عریض مرمریں محرابی ستونوں والا برآمدہ دُور تک نظر آ کر دائیں اور بائیں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اسی برآمدے میں کوریڈور والے درمیانی عظیم الشان دروازے کے علاوہ دائیں بائیں اور بھی کئی دروازے اور جوڑی جوڑی خوبصورت شیشوں والی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔

اندر کتنے کمرے تھے؟ کیا کچھ تھا؟ یہ اُس نے ابھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر کوریڈور ہی دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اندر کا حال کیا ہوگا۔

دوبارہ وسیع لان کی طرف رُخ کرتے ہوئے اب کے اُس نے بائیں جانب نگاہ کی۔ دائیں جانب کی طرح یہاں بھی پہاڑی تھی۔ اُس نے سُنا، اونچی مہمان خانے کے بالمقابل یہاں پہاڑی کو کاٹ کاٹ کر اوپر تلے کئی ٹیریس بنائے گئے تھے۔ سب سے نچلے ٹیریس پر طرح طرح کی کیکٹس نہایت صفائی سے اگائی گئی تھی۔ اُس سے اوپر والے ٹیریس پر نایاب قسم کے گلاب اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اُس سے اوپر والا ٹیریس کوہ بنفشی کے خوبصورت پھولوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس سے اوپر اعلیٰ قسم کی بیلی لگی ہوئی تھی۔

وہ اوپر ہی اوپر دیکھتا چلا گیا۔ سب سے اونچے اور آخری ٹیریس پر اُسے دو گروپوں میں سفید مرمر کی کرسیاں اور اُن کے درمیان میزیں نظر آئیں۔ گرد و پیش کے نظاروں کا لطف اٹھانے کے لئے بہترین جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

اُس نے مزید اُوپر نگاہ کی۔ پھر چوٹی پر اُویر گرین پائینز کو نیلگوں آسمان سے گلے ملتے دیکھا تو نگاہیں واپس پلٹ آئیں۔

اُس کے قدموں سے گز بھر کے فاصلے پر سلیٹ نما پتھر کی سیڑھیاں اُوپر جاتی بل کھاتی اپنی ٹیرسیوں کے ساتھ چلتی ہر ٹیرس کو شانہ دیتی اُوپر ہی اُوپر چلتی گئی تھیں۔

سیڑھیوں کے بائیں رُخ پر اُوپر ہی اُوپر کوئی درجن بھر دو رویہ سرونٹ کوارٹرز تھے۔ اُسی طریق پر کہ نچلے کوارٹروں کے چھت اوپر والے کوارٹروں کے لئے صحن کا کام دے رہے تھے، نچلے کوارٹروں کے آگے جگہ بنا کر گھاس اگائی گئی تھی۔ اور گھاس کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی سر سبز باڑ بھی موجود تھی۔

سر سبز باڑ کے عین درمیان سے پھر پتھر کی سیڑھیاں نیچے آ رہی تھیں۔ سیڑھیوں کو تکتا۔ ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے آہستہ قدم چلتا وہ پہاڑی کے دامن تک آ گیا۔ یہی سیڑھیاں نیچے تک آ کر پہاڑی کے دامن میں بنے باورچی خانے میں ختم ہوتی تھیں۔

باورچی خانہ کئی کمروں پر مشتمل نظر آ رہا تھا۔ اور پہاڑی کے دامن میں دور تک چلتا کوٹھی کے غسل خانوں اور ڈریسنگ رومز کے پچھلے دروازوں اور کھڑکیوں کے بالمقابل واقع تھا۔

کچھ سوچتا دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا وہ کوٹھی کے اس رُخ گھوم آیا۔

اب دائیں طرف کچن اور بائیں طرف غسل خانوں اور ڈریسنگ رومز کے دروازے اور کھڑکیاں تھیں، سامنے کا محرابی ستون والا برآمدہ بھی یہیں آکر خوبصورتی سے سے ختم ہو گیا تھا۔ چوڑے سلیٹ نما پتھروں کے بنے اس راستے پر ہر پتھر کے گرد سبز گھاس اُگ آئی تھی، جسے خوبصورتی سے تراش لیا گیا تھا۔

باورچی خانے سے ایک چھوٹا سا Passage کوٹھی تک جا کر ایک دروازے میں کھلتا تھا۔ جو یقیناً کھانے کے کمرے سے قریب تر ہوگا۔ بھیگنے کے امکان سے بچنے کے لئے اسی تپلے سے Passage کے اوپر چھت بھی تھی۔

وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچن کا حصہ ختم ہو گیا تھا۔ بائیں طرف چند سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ پچھلے برآمدے میں آ گیا۔ یہ برآمدہ بھی سامنے والے برآمدے کی طرح یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ وہی محرابیں تھیں اور وہی مرمریں ستون۔ اس برآمدے میں بھی کوریڈور کا پچھلا دروازہ اُسی شان سے کھل رہا تھا۔ دائیں اور بائیں اُسی طرح دروازے اور کھڑکیاں بھی کھل رہی تھیں۔ وہی چوڑی چوڑی خوبصورت کھڑکیاں اور منقش دروازے برآمدے کے بیچوں بیچ آکر وہ رک گیا۔ اُس نے سامنے دیکھا۔ برآمدے کی چوڑی چوڑی سفید سنگِ مرمر کی سیڑھیاں نیچے چمن میں اُتر رہی تھیں۔ خوبصورتی سے تراشے چمن کا فرش دائیں سے بائیں تک طویل برآمدے کی پوری لمبائی کے

ساتھ پھیلا نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی نایاب قسم کے پھولوں کے تختے نظر آ رہے تھے
چمن کے بعد اس نے دیکھا۔ بہت محنت سے تیار کی ہوئی کھیتوں میں
مختلف قسم کی سبزیاں اگائی گئی تھیں۔ آلو کے خوبصورت پودوں کے بعد تھے۔
ان گنت پکے مٹروں کی پھلیوں سے لدے پودوں کی دور تک پھیلی کھیتی نظر آئی
جولائی اگست! اور مٹر؟ قدرت کی جدت پسندی کی داد دیئے بنا وہ نہ
رہ سکا۔ مٹروں کے بعد اور بھی کئی قسم کی سبزیاں لگی نظر آ رہی تھیں۔

اس نے دائیں جانب کچن کے سائیڈ پہ دیکھا۔ کچن کے اختتام پر ہی
پہاڑی ڈھلان پہ بادام کا باغ تھا جس کے درختوں میں لگے ان گنت بادام
اپنی پوست میں سے جھانک کر باہر نکل آنے کو بے تاب نظر آ رہے تھے۔
پہاڑی کچھ آگے چل کر سبزیوں کی آخری کھیتی سے آگے نکلتے ہوئے بتدریج
کم ہوتی ختم ہو گئی تھی۔ پھر اسی پہاڑی کے پیچھے سے ایک اور سرمئی رنگ کا
پہاڑی سلسلہ نکل کر آگے کی قطار قائم رکھے ہوئے تھا۔ بادام والی پہاڑی
اور سرمئی پہاڑی کے درمیان باہر کی طرف سے اونچائی سے آتی چاندی کی طرح
چمکتی شوریدہ سر ندی سرمئی پہاڑی کے دامن میں گرتی اس کے ساتھ ساتھ
چلتی تا حدِ نگاہ رواں دواں تھی۔

برآمدے میں ہی چلتا وہ بائیں جانب آ نکلا۔ سیب کے باغ والی پہاڑی
سامنے سے چل کر برآمدے کے اس سرے تک آ کر ختم ہو رہی تھی۔

وہ چمن کے کنارے کنارے چلتا اب سبزیوں کے کنارے پر آ گیا تھا یہیں اُس نے دیکھا۔

اُس کے قدموں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر ایک عظیم الشان دو منزلہ جدید طرز کی محل نما کوٹھی ایستادہ تھی۔

اور یہیں اُسے اندازہ ہوا۔ قدیم اور جدید طرز کی محل نما کوٹھیوں میں لیول کا بڑا فرق تھا۔ وہ جدید کوٹھی سے پورے ایک منزل کی اونچائی پر کھڑا تھا۔ اس طرح کہ جدید کوٹھی کی نچلی منزل کی چھت اُس کے قدموں کے لیول پہ تھی اور خود وہ کوٹھی کے دوسری منزل کے بالمقابل کھڑا تھا۔ اسی منزل کے دو کمروں کی کھڑکیاں اور ایک ایک دروازہ اُسکی سمت کھل رہے تھے۔ دروازوں کے آگے نچلی منزل کی چھت پھیل کر کھلے ٹیرس کا کام دے رہی تھی وہیں جدید طرز کی لوہے کی تار کی سفید دو سیک کرسیاں اور درمیان میں کرسیوں کے ساتھ کی گول نازک سی شیشے کی میز رکھی تھی۔ میز پر شیشے کے خوشنما گول برتن میں کچھ پھل پلیٹ اور چھری بھی رکھے ہوئے تھے۔ پلیٹ میں کچھ چھلکے بھی تھے۔ جیسے ابھی ابھی کوئی پھل سے شغل کرنے کے بعد اُٹھ کر اندر گیا ہو۔

ٹیرس کے گرد لوہے کی خوبصورت ریلنگ تھی۔ اور وہ ریلنگ اُس کے قدموں سے کوئی فٹ بھر کے فاصلے پہ تھی۔

ریلنگ کے دائیں کونے سے جسپس کی خوبصورت سیڑھیاں نیچے اُتر تی تھیں
وہ قدیم کوٹھی کی سبزیوں کی کھیتی کے کنارے کنارے اور جدید کوٹھی کے
ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھنے لگا ۔

اب ریلنگ ختم ہو چکی تھی ۔ وہ سبزیوں کے کنارے کے ساتھ ساتھ مڑ گیا
تھا ۔ عین وسط میں پہنچ کر وہ رُک گیا ۔ طویل مرمریں ستونوں والا برآمدہ دور اُسکی
پیٹھ پر واقع تھا ۔

قدیم کوٹھی واقعی بہت اُونچائی پر واقع تھی ۔ جدید کوٹھی کے ریلنگ سے
جو سیڑھیاں نیچے گئی تھیں ۔ وہ کافی نیچے بہتی شوریدہ سر ندی میں بنے سنگ مرمر
کے ایک چوڑے چبوترے تک پہنچ کر ختم ہوتی تھیں ۔

پانی کی موجیں سنگ مرمر کے چبوترے کو کبھی صرف چھُو کر ۔ کبھی اُس
سے سر پٹخ کر گزر رہی تھیں ۔ تو کبھی پورے چبوترے پر سے لہرین کر گزر جاتی تھیں
چبوترے کے دوسرے رُخ پر بھی سیڑھیاں بنی تھیں ۔ یہ سیڑھیاں چبوترے
کی طرح سنگ مرمر کی تھیں اور اوپر چڑھ کر قدیم کوٹھی تک جا پہنچتی تھیں ۔

وہ چند قدم آگے چلا آیا ۔ اور اب اُس کے قدم اُنہی سیڑھیوں پر تھے ۔
لگتا تھا سیڑھیاں اور چبوترا قدیم کوٹھی کے ساتھ بنے تھے ۔ بعد میں جسپس کی یہ
سیڑھیاں بنا کر اُسے جدید طرز والی کوٹھی سے ملا دیا گیا تھا ۔

آہستہ آہستہ اُترتا وہ چبوترے پر آ پہنچ گیا ۔ نیچے شوریدہ سر پانی کا زبردست

شور تھا۔ اُس نے اُوپر نگاہ کی۔ ادھ کھلے باداموں کے پوست نظر آرہے تھے۔ اور بادام کے باغ کی پہاڑی کے اختتام اور سرمئی پہاڑ کے آغاز کے درمیان سے ندی آبشار بن بن کر نیچے گر رہی تھی۔

اُس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ پل میں ہی گہرے سیاہ بادلوں نے ہرسو ہلّہ بول دیا تھا۔

نیچے تا حدِ نظر پانی۔ اُوپر تا حدِ نگاہ سیاہ بادل۔ گرم سوٹ پہننے کے باوجود اُسے تھرتھری سی آگئی۔

جولائی اگست !! اور اس قدر ٹھنڈ !! ۔ کل تک وہ پشاور میں تھا۔ باوجود ائیر کنڈیشنڈ کمروں کے مارے گرمی کے اُس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ اور آج۔ یہاں ۔ موسم کا اس قدر تضاد ! وہ قدرت کی رنگینئ طبع پر ڈھیر سے مسکرا دیا۔

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ مڑ کر قدیم کوٹھی کو دیکھنے لگا۔ جسے دائیں بائیں سے پہاڑیاں اپنے گھیرے میں لیئے ہوئے تھیں۔ جو سامنے سے پتھر کی فصیل نما دیوار اور آہنی مضبوط گیٹ سے محفوظ کی گئی تھی۔ اور جو پیچھے سے شوریدہ سر ندی میں جا کھلتی تھی۔

رُخ تدرے پھیر کر وہ جدید کوٹھی کو بھی دیکھنے لگا۔ دونوں کوٹھیاں سیاہ

گھٹاؤں میں لپٹی شام کے دھندلکے میں اپنی عظمت کی آپ گواہی دے رہی تھیں۔

یہ دونوں کوٹھیاں فصیح احمد کی ملکیت تھیں۔ اس علاقے کے مانے ہوئے رئیس کی۔

جدید طرز والی میں وہ خود مع اپنی اکلوتی بیٹی کے قیام کرتے تھے جبکہ۔ قدیم محل انہوں نے اپنی اسی اکلوتی بیٹی کے نام کر دیا تھا۔ قدیم محل چونکہ خالی ہوتا تھا۔ اس لئے فصیح احمد نے گورنمنٹ کو دے رکھا تھا۔ کرایہ پر نہیں۔ کہ یہ انھیں اپنی سبکی معلوم ہوتی تھی، بلکہ ایک غیر متعین عرصے تک۔ جب تک کہ خود انہیں ضرورت نہ پڑ جاتی۔ یا پھر گورنمنٹ کی ضرورت پوری نہ ہو جاتی۔ اور

گورنمنٹ نے اسے ڈپٹی کمشنر کے ریذیڈنس کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے یہ کوٹھی ڈی سی کے مصرف میں آتی رہی تھی۔ فصیح احمد کم ہی اپنی جائے رہائش پر نظر آتے۔ اپنے وسیع کاروبار کے سلسلے میں وہ اکثر و بیشتر ملک سے باہر رہتے۔

پچھلے چند ماہ سے وہ امریکہ میں تھے۔ کل شام افواہ تھی کہ وہ واپس پہنچنے والے ہیں۔

خود وہ کل دوپہر کو ہی یہاں پہنچا تھا۔ رات اس نے ڈاک بنگلے میں گزاری تھی

آج صبح یہاں کے سابقہ ڈی سی سے چارج لیا تھا۔ آج سارا دن اس کوٹھی میں صفائی وغیرہ ہوتی رہی۔ اس لئے آج رات پھر اُس نے ڈاک بنگلے میں گزارنی تھی۔

کچھ اس کوٹھی کو دیکھنے کا خیال تھا۔ اور کچھ فصیح احمد سے ملاقات کرنا اس کا اخلاقی فرض بھی تھا۔ سو وہ ڈاک بنگلے سے چلا آیا۔

سب سے پہلے اُس نے ٹیلیفون کر کے فصیح احمد کا پتہ کرنا چاہا تھا۔ کہ آیا وہ واقعی کل شام پہنچ گئے تھے؟ یا افواہ یوں ہی افواہ تھی؟؟ پتہ اُن کی اکلوتی بیٹی سے کیا جا سکتا تھا۔ جس نے چھوٹتے ہی اُسے لوفر قرار دیدیا تھا۔

سیڑھیاں پڑھتے چڑھتے وہ خوبصورتی سے مسکرا دیا۔ جانے کیوں؟

کچھ دیر قبل کی کوفت و توہین کے احساس کا اب اُس کے خوبصورت چہرے پہ کوئی تاثر نہیں تھا۔ موسم کی رنگینی اور قدرت کی بے پناہ فیاضیوں کا اثر تھا شاید

سبزیوں کی کھیتوں کے کنارے کنارے احتیاط سے چلتا وہ باداموں کے باغ کی طرف رواں تھا۔ باغ کے اس کونے کے ساتھ عین پہاڑی کے دامن میں ندی کے اُونچے کنارے پر واقع وسیع اور بے انتہا خوبصورت سن روم تھا۔ بنانے والے کی محنت اور بنوانے والے کے ذوق پر دنگ سا چند لمحے وہ وہیں کھڑا رہا۔

تبھی سن روم کے چھوٹے بڑے تمام شیشے یکبارگی جگمگا اٹھے۔ اُس نے

پلٹ کر دیکھا۔ جدید طرز کے محل میں تمام بیرونی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اور یہ اُنہی بتیوں کا عکس تھا۔ کہ منعکس ہو کر تمام کے تمام سن روم کو روشن کر گیا تھا۔

اُس نے مزید دیکھا۔ ایک بھاری بھرکم گورنس نما عورت سامنے کے ٹیرس پر میز پر سے دہی کچھ دیر قبل والے چپل کے برتن اُٹھا رہی تھی۔

اور کمرے کے اندر۔

ایک نازک سا نسوانی ہیولہ کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے میں مگن تھا۔ اچانک ہی بارش کے موٹے موٹے قطرے پڑنے لگے۔ وہ سن روم کے شیڈ میں آ گیا۔ اب۔

قدیم شاہکار میں بھی جگمگ جگمگ ہونے لگا تھا۔ اُس نے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ شام کے سائے غالب آ چکے تھے۔ ہر سو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ٹھنڈ خاصی اتر آئی تھی۔

تیز تیز قدم اٹھاتا بارام کے باغ کے دامن میں چلتا لمبے چوڑے کچن کے آگے سے گزرتا دائیں طرف برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ یہ وہی سامنے والا مرمریں ستونوں والا برآمدہ تھا۔ وہیں سے وہ پورچ میں اتر آیا۔ اور کار میں بیٹھتے ہی گاڑی چلا دی۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ بجری کی سڑک پر چلتا وہ سیب کے باغ کے ساتھ گھوم کر مڑا اور پھر سیدھا گیٹ تک چلا گیا۔ گیٹ پر کی بتیاں بھی جل رہی تھیں اور چوکس محافظ مؤدب ہو کر کھڑے

ہو گئے تھے۔

"آپ اکیلے ہیں صاحب۔ ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ چلے؟"

وہ دونوں بیک وقت بول اُٹھے۔

"نہیں شکریہ" اُس نے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ جو اُس نے اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت کہے تھے۔

کم از کم آج وہ اس علاقے اور اس کوٹھی میں اکیلے ہی گھومنا چاہتا تھا اس کے بعد اس کا اندر باہر آنا جانا کافی پُرتکلف طریق پر ہوگا یہ اُسے معلوم تھا۔ اور تکلف سے۔ دوسرے لفظوں میں پابندی سے اُسے چڑ تھی۔

گیٹ سے نکل کر اُس نے دیکھا۔ پولیس کانسٹیبل حسبِ سابق پہرے پر موجود تھے۔ اُن کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیتا وہ آگے بڑھ آیا۔ پہاڑ اب بھی دونوں طرف اندھیروں کی لپیٹ میں ایستادہ تھے۔ اُن کے بیچوں بیچ چکنی سرمئی سڑک پر وہ جا بجا لگے کھمبوں میں ٹیوب لائیٹ کی روشنیوں میں چلا آ رہا تھا۔

دائیں طرف اُس نے دیکھا۔ اُس کا اور اُس کے سٹاف کا لمبے احاطے پر محیط آفس واقع تھا۔ اس سے بھی آگے نکل آیا۔ تو بیرونی گیٹ تھا۔ جو پوری سڑک کی چوڑائی پر واقع تھا۔ اور اندرونی گیٹ سے کہیں زیادہ مضبوط اور اونچا تھا۔ یہاں بھی پولیس کا پہرہ تھا۔

گیٹ سے باہر نکل کر وہ پہاڑی سڑک کی گولائیاں عبور کرتا نیچے بازار میں اُتر آیا۔ پھر قدرے سیدھی سڑک پر ڈرائیو کرتا دائیں طرف کچی سڑک پر ہو لیا۔ یہاں بھی اُسے نسبتاً اُوپر جانا پڑا۔ کہ ڈاک بنگلہ بھی اُونچائی پر واقع تھا۔

۲

"یار کھانا منگواؤ"۔ اُسے اندر داخل ہوتے دیکھتے ہی نعیم لحاف سے تھوڑا سا سر باہر نکال کر بولا۔

"ایک ایک پل گنتے رہے ہو میرے خیال میں"۔ وہ کوٹ اُتار کر ہینگر میں لٹکاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے انتظار میں نہیں۔ کھانے کے انتظار میں"۔ وہ ابھی بھی لحاف کا ذرا سا کونہ سرکائے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں کھانے کے انتظار میں پل پل گن رہے تھے۔ مجھ غریب کا کون انتظار کرتا ہے"۔ وارڈ روب میں سے نائٹ سوٹ نکال کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"میرا کہنا مان لیا ہوتا تو آج تمہارا بھی کوئی انتظار کر رہا ہوتا"۔ وہ ہمیشہ اُسے کسی نہ کسی لڑکی کو چانس دینے کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ "اب بھی وقت

ہے ویسے۔۔۔۔۔" اُس نے لحاف ایک طرف پھینکا اور اُٹھ کر خود ہی کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور کامران کو اچانک ہی جیسے یاد آیا۔

"میں اپنا رینڈیڈنس دیکھنے گیا تھا"۔ کپڑے بازو پر لٹکائے وہ جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ماشاءاللہ"۔ نعیم واپس بستر میں گھس کر گویا ہوا۔

"جاتے ہی میں نے ٹیلیفون کیا۔۔۔۔۔"

"سُبحان اللہ"۔

"سُنو تو"۔ وہ جھنجھلا سا اُٹھا

"سُن رہا ہوں"۔ وہ واقعی سُننے لگا۔

"خاک سُن رہے ہو"۔ وہ ڈریسنگ روم کی طرف جانے لگا۔

"بھئی سُن رہا ہوں نا۔ تم اپنا رینڈیڈنس دیکھنے گئے تھے"۔ اُس نے بستر سے نکلتے ہوئے لپک کر اُسے جالیا۔

"اور بھی کچھ کہا تھا"۔ وہ پھر وہیں کھڑا ہو گیا۔

"وہ نہیں سُنا۔ پھر کہہ دو"۔ اب کے وہ اُس کے قریب کامران والے بستر میں گھس گیا۔

"رینڈیڈنس بہت خوبصورت ہے"۔

"وقت وقت کی بات ہے۔" اُس نے پھر مداخلت کی۔

"کیوں؟ میں تمہیں اس ریذیڈنس کے قابل نظر نہیں آتا؟"

"یار سچ پوچھو تو . . . ." وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "واقعی اس قابل نہیں ہو . . . ." اُس کے لہجے میں انکسار تھا۔

"کیوں؟ اپنے ڈیڈ کے یہاں ہماری شان کسی شہزادے سے کم ہوتی ہوتی ہے کیا؟" کامران نے اتراکر کہا۔

"اس میں تو شک نہیں لیکن پتہ ہے یہ کوٹھی بھی کسی کم آدمی کو نہیں ملا کرتی۔"

"ڈی سی ہی کو ملتی ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔

"اور تم اپنے کو ڈی سی سمجھتے ہو۔"

"اچھا پلیز! سنو!"

"ہوں۔" وہ اچھی طرح لحاف میں دبک گیا۔

"بھئی برف تو نہیں پڑی ابھی۔ کیوں بار بار لحاف میں گھسے جا رہے ہو۔" اور ساتھ ہی اُس نے اس پر سے پورا لحاف اُٹھا کر نیچے قالین پر پرے ڈال دیا۔

"تم پشاور سے آئے ہو۔ دماغ یخ ہوتے ہوتے وقت لوگے۔" وہ تکیوں پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اپنی تو ہڈیاں سردی سہتے سہتے اکڑ گئی ہیں۔"

" اچھا اب سنو " ۔

" سنا بھی چکو نا " ۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر پھر لحاف کھینچ لیا ۔

"جاتے ہی میں کوٹھی کے اندر گیا ۔ تاکہ مسٹر فصیح احمد کا پتہ کروں ، کہ آیا کل شام وہ افواہ کے مطابق واقعی پہنچ گئے تھے ۔ ؟ اور اگر وہ موجود ہوں گھر پر ۔ تو اُن سے مُلاقات کی جائے ۔"

" پھر ؟"

" پھر میں نے اُن کی بیٹی سے دریافت کرنا چاہا ۔۔۔" ۔

" دھت تیرے کی " ۔ وہ یکدم ہی سیدھا ہو بیٹھا ۔ " نوکر وغیرہ کیا سب مُر گئے تھے اُن کے ؟"

"کیوں ؟ بیٹی سے پوچھا کیا جرم تھا ؟ پھر بیٹی سے بہتر اُن کا پروگرام کون جان سکتا تھا ؟" ۔

" اچھا پھر ؟"

" میں نے کہا ۔ " ہیلو " ۔ " اُس کا لہجہ اچانک شریر ہو گیا ۔

"جبھی مجھے ساتھ لے جانے پر اعتراض تھا ۔" اُس نے خالص جھوٹ بولا ۔

" پلیز نعیم ! تم نے خود ہی تھکن اور ٹھنڈ کا کہہ کر ٹالا تھا " ۔

" اچھا پھر کیا ہوا ؟ " ۔

"ہونا کیا تھا۔ میں نے اپنا نام بتانا چاہا۔ وہ آگے سے بولیں۔ انہیں میرا نام پہلے سے معلوم ہے"۔ وہ شرارت سے اُسے تکتا خاموش ہو گیا۔

"کیا مطلب؟ یعنی کہ؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔"۔

"ہاں ہاں اور پتہ ہے میرا نام کیا بتایا؟"

"جانِ من۔ جانانِ من۔۔۔" وہ لحاف ایک طرف پھینکتا ٹانگیں نیچے لٹکاتے ہوئے فوراً بولا۔

"اوں ہونہہ۔ اس سے بھی کچھ زیادہ"۔ وہ ہنس پڑا۔

"دلبر۔ دلربا۔۔۔۔"

"یہ بھی نہیں"۔ وہ مزید زور سے ہنس دیا۔

"اس سے زیادہ تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہو گا۔" سامنے ہی میز پر کھانا لگتے دیکھ کر وہ اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سُن تو"۔ کامران نے اپنا پاؤں اُس کے پاؤں میں اڑا دیا۔ اور وہ اوندھے منہ قالین پر جا گرا۔

"بدمعاش کہیں کے"۔ سیدھا ہوتے ہوئے اس نے اُس کے بازو میں لٹکے کپڑے بستر پر پھینکے اور اُسے ہاتھ سے پکڑے پکڑے کھانے کمرے میں چل دیا۔

"وہ مارا"۔ کامران زور سے بولا۔

"کیا ہوا؟"

"آج میری عزت افزائی پر عزت افزائی ہو رہی ہے"۔

"ظاہر ہے ڈی سی کی پوسٹ پر آئے ہو۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اور پذیرائی کس طرح ہوئی ہے پتہ ہے؟"۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

"تبا بھی دو اب"

"ہاں تو وہ کہتی تھیں میرا نام انھیں اچھی طرح معلوم ہے"۔

"مثلاً؟"

"لوفر"۔

اور نعیم کو کباب کھاتے کھاتے اچھو ہو گیا۔

"تم نے ضرور کچھ کہا ہوگا" وہ اچانک بولا۔

"میں اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہوں" وہ رعب سے بولا۔

"اور ڈی سی بھی ہو"

"اور کیا"۔

"ویسے کامران ایک بات ہے"۔

"کیا؟"۔

"بگڑے نہیں ہو"۔ وہ انکسار سے بولا۔

"یہ تو تم کہتے ہو۔ ورنہ تو لوگ مرعوب ہوئے جا رہے تھے ماڈرن لُٹ کو دیکھ دیکھ کر۔"

"اور ساتھ ساتھ لوفر سمجھ کر ڈانٹتے بھی جا رہے تھے"۔

اور کامران کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔

"بھئی آخر میں تمہیں ڈی سی کیوں نہیں لگتا ہے"

پچھلے تین چار سال سے وہ سروس میں آیا تھا۔ مگر نعیم تھا کہ کسی طرح یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"اس لئے کہ تین سال بی اے میں فیل ہو جاتے تو بھی یہی سوٹ تمہیں آنٹی وانکل پہننے کو دیتے۔ تب بھی تم یہی جچیر لگتے۔ اور آج سے بہتر لوفر کہلا سکتے تھے"۔ وہ گلاس میں پانی ڈال کر منہ سے لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

وہ اور نعیم خالہ زاد بھائی تھے۔ دونوں تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ گہرے دوست بھی۔ اور کلاس فیلوز بھی رہ چکے تھے۔ مگر۔

بقول نعیم پہلے اُسے سکول سے پیار تھا۔ نکل آنے کو دل نہ کرتا تھا۔ سو اور سٹوڈنٹس سے ایک سال بعد میں ہی نکلا۔ پھر کالج سے اس قدر عشق ہو گیا کہ تین سال الیف اے میں۔ اور بی اے دو سال کے بجائے تین سال میں کلیر کیا۔ اور اب ایم اے میں بھی تیسرا سال تھا۔ دل اس کا ہنوز

ان طلسماتی فضاؤں میں رہنے کو مچل رہا تھا۔

پچھلے تین سال سے وہ یہاں کی یونیورسٹی میں ہوسٹل میں مقیم تھا۔ دو بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا۔ باپ کا وسیع کاروبار تھا۔ دھن دولت کی کمی نہ تھی۔ عیش و عشرت میں وقت گزار رہا تھا۔ پاس ہو کر نکلنا تو جانے عملی زندگی میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے

بس کانوں پر ہاتھ دھر کر آنکھیں بند کیے مگن تھا۔ کامران کی چھوٹی بہن بچپن سے اُس کے نام تھی۔ اس بار ماں باپ کو یقین کامل تھا۔ کہ وہ پاس ہوگا۔ اور وہ بھی اس کے سر پر سہرا باندھ کر اپنے ارمان پورے کر سکیں گے۔

بہنیں تو دونوں اپنے گھربار کی ہو چکی تھیں۔ اکلوتا نعیم ابھی باقی تھا۔ اور کتنی چاہتوں سے وہ اپنی بھانجی کو لانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

کامران کے والد پچھلے سال ہی چیف انجینئر ریٹائر ہوئے تھے۔ آبائی اجداد کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لیے آجکل گھر پہ ہی رہ کر پچھلے کئی سالوں کی تھکن اتار رہے تھے۔

کامران بھی اکلوتا تھا۔ دو بڑی بہنیں تھیں۔ اُن کی شادیاں ہو چکی تھیں بچوں والی تھیں اب۔ ایک بہن چھوٹی تھی۔ بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ اور۔ نعیم کے پاس ہونے کی منتظر تھی۔

کامران اور نعیم اکٹھے ہی ایچی سن کالج میں پڑھے تھے۔ جہاں نعیم کو

سکول اور کالج سے اتنا اُنس تھا کہ پاس ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں کامران ڈبل پروموشن کے علاوہ ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ ڈویژن لیتا رہا۔

ایف ایس سی۔ کے بعد انجینئرنگ میں داخلہ لینا چاہا۔ مگر عمر ایک سال کم ہونے کی وجہ سے ایک سال انتظار کا کہا گیا۔ آرمی جوائن کرنے کا سوچا تو والد نے انکار کر دیا۔ سو بی ایس سی میں ایڈمشن لے لیا۔ پھر ایم ایس سی اکنامکس کیا۔ سی ایس پی کا امتحان دینا چاہا۔ یہاں بھی وہی ایک سال کی کم عمری آڑے آئی۔ بیکار بیٹھنے سے ہائیر ایجوکیشن لینے امریکہ جانا بہتر سمجھا۔ دو سال وہاں گزارے۔ آتے ہی سی ایس پی کا امتحان دیا۔ اے کلاس میں پاس ہوا۔ چند ماہ ٹریننگ لی۔ دو ڈھائی سال اے سی رہا۔ کچھ عرصہ پنجاب میں رہا۔ آخری پوسٹنگ پشاور کی تھی۔ اور آج یہاں۔ پروموٹ ہو کر ڈی سی کا پہلی بار چارج لیا تھا۔

کامران کی عمر ستائیس سال سے چار پانچ ماہ اوپر تھی۔ اسی طرح نعیم بھی ستائیس سال کا پورا ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچتے ہی وہ سیدھا نعیم کو لینے ہوسٹل گیا تھا۔ اور اُسے ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ فی الحال عارضی طور پر۔ بعد میں مستقل اُسے اپنے پاس رکھنے کا ارادہ تھا۔ کچھ ایک ہی سٹیشن پر اکٹھے رہ کر دونوں سے دور رہا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ نعیم بھی ہوسٹل کے کھانے کھا کھا کر اکتا سا گیا تھا

"تمہاری طرح"۔

"اور کیا؟ - تم سے بہتر سوٹ میں نے ابھی ابھی تبدیل کیا ہے۔ تم سے زیادہ سمارٹ میں اب بھی لگ رہا ہوں۔

یہ اور بات ہے کہ کسی نے لوفر نہیں کہا - اب تک"۔

"بالکل بالکل - کل آتے وقت سمینہ بھی کہتی تھی بھائی جان! آپ وہاں ہوں گے تو شاید" وہ "بھی اپنی آوارگی ختم کر کے پڑھنے میں دل لگائیں"۔

اور نعیم کے فلک شگاف قہقہے گونج اُٹھے۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

"کیسی رہی؟" قہقہے کچھ تھمے تو کامران نے پوچھا۔

"چھوٹتے ہی لوفر تو نہیں کہا"۔ وہ اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"تو آوارہ اور لوفر میں فرق ہے؟"

"بالکل - ایک اردو اور دوسرا انگلش لفظ ہے"۔

"معنی تو ایک ہیں"۔

"منہ پر تو نہیں کہا"۔

"وہ دن بھی آجائیگا"۔

"اور تمہارا آ بھی چکا - ویسے آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا؟ سُنا ہے گھر بالکل پاس پاس ہیں کسی دن سینڈل بھی ہوا میں تیرتی سر تک آجائے تو بعید نہ ہوگا"۔

"وہ دن نہیں آنے گا"۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ دِل نشین انداز میں مسکرا دیا۔

" تمھاری مسکراہٹ مجھے خطرے کا سگنل دکھا رہی ہے۔ کہیں دیکھ کر "۔
اُس نے شرارت سے آنکھ دبائی "۔ تو نہیں آرہے ہو؟"۔
" اوں ہونہہ۔ آواز سُنی ہے فی الحال "۔
" اور آواز سے شکل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے "۔
" پھر دو صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ یا تو وہ بدصورت ترین بدمزاج لڑکی ہو گی۔ اور یا پھر "۔ وہ قدرے رُکا۔ شرارت سے کنکھار انکھیوں سے اُسے دیکھا۔" کسی مُلک کے تخت پہ بیٹھی ملکوتی حسن والی جابر ملکہ کی طرح "۔
" کام دونوں صورتوں میں نہیں بنے گا "۔ نعیم ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔
" کیا مطلب؟ "۔ وہ بھی کرسی پرسے کھِسکا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔
" بدصورت ترین لڑکی ہو گی ۔ تو میں تمھیں اُس سے شادی کرنے نہیں دوں گا ۔ اور حسین جابر ملکہ کی طرح ہو گی تو وہ تمھیں لفٹ نہیں دے گی "۔ وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتا اطمینان سے بولا۔
چند لمحے کامران خاموشی سے ہاتھ دھوتا رہا۔" اور اگر وہ اپنے املاک کے طلسماتی ماحول کی طرح کچھ کچھ سیبوں سے۔ کچھ باداموں سے۔ کچھ اس لچکتی بل کھاتی ندی سے جو اُس کے گھروں کے پاس بہتی ہے۔ کچھ اُن نرم خرام ہواؤں سے ۔۔۔۔"۔ اس نے کوئی کھرا سا جواب نہ پا کر مڑ کر

دیکھا۔ نعیم پاس ہی کھڑا دیوار سے ٹیک لگائے۔ آنکھیں موندے عجیب مضحکہ خیز شکل بنائے کھڑا تھا۔

" اور کچھ ان کالی کالی گھٹاؤں سے۔ کچھ رم جھم کی پھوار سے ملتی جلتی ہو۔ تو ؟"۔ اُس کے کان میں جا کر اُس نے "تو" اتنے زور سے کہا۔ کہ وہ آنکھیں کھول کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے کامران اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ " آؤ سو جائیں اب"۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ اُسے ہاتھ سے تھام کر بیڈ روم کی طرف لے چلا۔

" تمہاری بات کا جواب سوچ رہا ہوں"۔ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

" بستر میں سوچ لینا"۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر دونوں ہی ضروری کاموں سے نمٹ کر نرم و گرم بستروں میں گھس گئے۔

" اب جواب دو"۔ وہ کروٹ نعیم کی طرف لیتے ہوئے بولا۔

" ویسے مجھ سے الگ رہ کر بدمعاش کافی ہو گئے ہو"

اور کامران کھل کر ہنس دیا۔

" یہ میری بات کا جواب ہے ؟"۔

" پکے لوفر ہو"۔ نعیم لحاف سر تک کھینچتے ہوئے بولا۔ " چاہتے ہو ہو اُسی کے متعلق بولتا جاؤں میں۔ سب سمجھ رہا ہوں"۔

" لاجواب ہو گئے ہو نا"۔ وہ بھی لحاف کندھوں تک لیتے ہوئے

سیدھا لیٹ گیا۔

"غیر کی بہو بیٹی کے متعلق ایسا سوچنا کہاں کی شرافت ہے؟"۔
نعیم ہاتھ بڑھا کر لیمپ آف کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

اور کامران مزید ہنس دیا۔

"وہ کسی کی بہو نہیں ہے"۔

"بیٹی تو ہے"۔

"دیکھا جائیگا"۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"ہنسی بھی لوفروں والی ہے"۔ وہ بڑبڑایا۔

"آج لوفر کی گردان کیوں کئے جا رہے ہو؟" کامران سمجھ رہا تھا وہ کیوں بات بات پر اسے لوفر کہے جا رہا تھا

"ہو ہی لوفر"۔ وہ اطمینان سے کہتا گویا سو ہی گیا۔

"میں بھی سمجھ لوں گا اُسے"۔ وہ جیسے خود سے بولا۔

"کسے؟" نعیم نے یکدم ہی سر لحاف سے باہر نکال لیا۔

"اُسے"۔ وہ بھی ہنستے ہوئے اسی انداز میں بولا۔

"اس لڑکی کو؟"۔ وہ قدرے حیرت سے پوچھنے لگا۔

"ہاں اُس لڑکی کو"۔ اس نے اطمینان سے کہا۔

اور کروٹ دوسری طرف پھیر لی۔

۴

آج اُسے یہاں شفٹ ہوئے دوسرا دن تھا۔ ساتھ ہی وہ نعیم کا بھی بوریا بستر ہوسٹل سے اُٹھوا لایا تھا۔ اب وہ یہیں سے یونیورسٹی جاتا آتا تھا۔

اور کامران خوش تھا۔ بہت۔ اُسے اچھا سٹاف ملا تھا۔ قدر دان لوگ ملے تھے۔ سحر آفریں ماحول ملا تھا۔ عرصہ بعد نعیم کی سنگت میسر آئی تھی۔ اور عرصہ بعد اُن کے قہقہے اکٹھے گونجے تھے۔

کوٹھی میں سات بیڈ روم تھے۔ ہر ایک کے ساتھ ڈریسنگ روم اور ملحقہ جڑے باتھ روم تھے۔ ہر بیڈ روم بہت کشادہ تھا۔ ہر ایک میں بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہر کمرہ قدیم طرز کے نایاب فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہر کھڑکی اور دروازے پر قیمتی اور بھاری پردے آویزاں تھے۔ بہت قیمتی اور بھاری طرز کی مسہریاں نرم فوم سے ڈھکی موجود تھیں۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر لیمپ رکھا ہوا تھا۔ ہر ڈریسنگ روم میں قدیم طرز کی چوڑے اور قیمتی شیشے والی ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی۔ بڑے بڑے وارڈ روب تھے۔ اور باتھ رومز میں بھی ہر قسم کی آسائش مہیا تھی

اس کا بیڈ روم بھی باقی بیڈ رومز کی طرح کشادہ تھا۔ مگر قدرے الگ تھلگ

اور رُخ اندرونی چمن کی طرف تھا۔ فرش پر بچھا قالین بے حد قیمتی اور گداز تھا
کھڑکیوں اور دروازوں پر کے پردے بھاری اور بے حد قیمتی تھے۔

دوسرے بیڈ رومز کے برعکس اس بیڈ روم کا سارا فرنیچر جدید ترین فیشن کا تھا۔ لمبی چوڑی کھڑکی کے پاس ہی اُس کا چوڑا خوبصورت اور نرم فوم کا بیڈ تھا۔ بستر پر سفید چادر تھی پروں والے سفید نرم نرم تکیے تھے۔ اور بہت ہی نرم اور گرم دو کمبل تھے۔ کمبلوں کے نیچے سفید چادر لگی تھی۔ اور پورا بستر بہت ہی قیمتی پینک بیڈ کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ دونوں طرف بہت نفیس بیڈ سائیڈ ٹیبل تھے۔ جن میں سے ایک پر اس کا قیمتی ٹرانسسٹر سیٹ و لیمپ اور دوسرے پر ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔

بیڈ والی کھڑکی سے سیب کے باغ کا کچھ حصہ اور کچھ جدید کوٹھی کا پورشن نظر آتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں چوڑی سی رائیٹنگ ٹیبل اور اس کے آگے گھومنے والی کرسی رکھی تھی۔

دوسری سمت کھڑکی کے پاس قیمتی فوم کا لمبا چوڑا صوفہ سیٹ اور اس کے آگے میز رکھی ہوئی تھی۔

ڈریسنگ روم میں جدید طرز کی قیمتی مردانہ ڈریسنگ ٹیبل تھی بڑا سا وارڈ روب تھا۔ کھڑکی یہاں بھی چوڑی تھی۔ اور جدید کوٹھی کے مین سامنے کھلتی تھی۔

باتھ روم میں دورِ جدید کی ہر آسائش مہیّا کی گئی تھی ۔ باتھ روم کا بیرُونی دروازہ اندرونی محرابی برآمدے میں جدید کوٹھی کی طرف کھلتا تھا۔

ڈرائینگ روم ایک بڑے ہال سے مشابہ تھا جس میں چاروں طرف دیوار کی لمبائیوں کے ساتھ قیمتی قسم کے صوفے لگے ہوئے تھے ۔ درمیان میں میزیں تھیں ۔ قیمتی بھاری پردے کھڑکیوں اور دروازوں پر لگے ہوئے تھے ۔ ڈرائینگ روم کا ایک دروازہ کوریڈور میں دوسرا بیرونی محرابی برآمدے میں اور تیسرا کھانے کمرے میں کھلتا تھا ۔

کھانے کا کمرہ بھی ہال نما تھا ۔ اُس کے بیچوں بیچ تقریباً پوری لمبائی تک میز تھی ۔ اور ارد گرد کوئی دو درجن کرسیاں میز اور کرسیاں بہت قیمتی لکڑی کی اور قدیم آرٹ کا مکمّل نمونہ نظر آرہی تھیں ۔

شیشے کی الماریوں میں خوبصورت اور قیمتی ڈنر سیٹ اور دیگر دیدہ زیب برتن سجے نظر آرہے تھے ۔ کھانے کمرے کا ایک دروازہ کوریڈور میں ایک ڈرائینگ ۔ روم میں اور تیسرا کچن کی طرف کھلتا تھا ۔

کوٹھی اُس کے لئے بہت بڑی اور وہ بالکل تنہا تھا ۔ اچھا تھا نعیم بھی اِدھر شفٹ ہوگیا تھا ۔ ورنہ بور ہی ہوتا بیٹھے بیٹھے ۔ "پونے چار ہوئے ہیں اور ٹھیک چار بجے تم نے کہا تھا چائے پہ پہنچا ہے" ۔ نعیم اُس کے بیڈ روم میں آتے ہوئے بلا تمہید بولا ۔

"یار تھک گیا ہوں باہر سے کھا کھا کر۔" وہ تھکا تھکا سا لہجہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واقعی جب سے آیا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا اور چائے باہر ہی ہوتے تھے۔ کبھی کوئی انوائیٹ کر لیتا تھا تو کبھی کوئی۔ کبھی سرکاری لوگ اور کبھی سرکاری لوگ اور کبھی غیر سرکاری۔

"رات کا کھانا تو گھر پر ہی آ رہا ہے۔ باہر نہیں جانا پڑے گا۔" نعیم نے اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا فصیح احمد کے گھر سے آ رہا تھا۔ فصیح احمد موجود ہوتے تھے۔ تو نہایت پر تکلف طریق پر ڈی سی کو اپنے یہاں بلایا کرتے تھے۔ کبھی خود موجود نہ ہوتے۔ تو اسی طرح ہوتا۔ کھانا ان کے گھر سے ضرور پہنچتا۔

"تم ہی کھانا وہ تو۔" وہ ڈرائنگ روم سے بولا۔

"تمہاری تو ان دیکھی دشمنی ہے"۔

"ان دیکھی نہیں۔ دیکھی دشمنی ہے" کپڑے بدلتے بدلتے اس نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"اس کا سایہ دیکھا تھا پردے برابر کرتے ہوئے"۔

"خاصے نظر باز ہو۔"

"تم سے کم ہوں"

میں نے کیا کیا ہے؟" ۔

" للچاتے تو رہتے ہو نا" ۔

" بدمعاش " ۔ نعیم ہنستے ہوئے بولا ۔

" ویسے ۔۔۔" وہ کپڑے بدلتے بدلتے دروازے سے جھانکنے لگا ۔ " دل چاہے تو تم بھی کرو ۔ کھلی چھٹی ہے ۔"

" مردانہ دنیا کہیں " ۔ نعیم نے گویا سہم کر کہا ۔

" اُسے پتہ بھی نہیں چلے گا ۔" کامران نے بھی پوری رازداری سے کہا ۔

" تمھاری بہن ہے سائے سے بھی دشمنی کرتی ہے سوچ لو ۔" نعیم نے ہاتھ میں پکڑا رسالہ میز پر پھینکتے ہوئے کہا ۔

اور کامران زور زور سے ہنستا ڈریسنگ روم سے باہر نکل آیا ۔

" چلو " ۔ اُس نے نعیم سے کہا ۔

" چلو " ۔ نعیم بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا ۔

۴

آج وہ کوئی تین بجے تک آفس میں رہا تھا ۔ کئی فائلیں چیک کرنی تھیں کئی دستخط کرنے تھے ۔ کئی فارمز دیکھنے تھے ۔ کئی اپیلیں پڑھنی تھیں ۔ اور

کئی دیہی راستوں پر غور کرتا تھا۔

پھر آخر میں دو دو چار علاقے کے چند معتبر آدمی اپنے علاقے سے متعلق اپنی کچھ مشکلات بتانے آ گئے تھے۔ اور یوں آتے اُٹھتے اُٹھتے تین بج گئے۔

آج پہلی بار وہ گھر میں کھانا کھانے آ رہا تھا۔ تھکا تھکا یا سا وہ واک کرتا کوٹھی میں آیا۔ نعیم کھانا کھا کر آرام کرنے لگا تھا شاید۔ اُس نے اُسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آہستہ قدم کوریڈور میں سے گزرتا اپنے بیڈروم میں گیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ ہاتھ منہ دھوتے۔ قدرے تازہ دم ہوا۔ واپس باہر نکلا۔ اور اُسی آہستگی سے کھانے کمرے میں چلا آیا۔

میز پر لگا گرم گرم کھانا دیکھ کر اُس کی بھوک چمک اُٹھی۔ کرسی کھینچ کر وہ بیٹھ گیا۔ پلیٹ میں چاول نکالتے نکالتے وہ خود بخود ہی مسکرا دیا۔ نعیم کھانے پر کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا تھا۔ جبھی تو اس عمر میں بھی خاصا پہلوان لگتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ سیب چھیلنے لگا۔ اب اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ ہونٹوں پر دلنشیں مسکراہٹ بکھری تھی۔ اور آنکھیں کسی شوخ خیال سے شوخ ہوئی جا رہی تھیں۔

وہیں بیسن میں ہاتھ دھو کر تولیے سے پونچھتا وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی۔ بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔ پھر آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے۔ چند لمحے وہ کسلمندی سے بستر میں پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر منہ دھویا۔ کپڑے

بدل لیے۔ اور باتھ روم کے ہی بیرونی دروازے سے باہر نکل آیا۔

سورج سیب کے باغ کے پیچھے مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ سرخی مائل بڑے بڑے سیب سنہری چمک لیے درختوں کو مزید جھکائے دے رہے تھے

سرمئی بادلوں کے ٹکڑے سنہری لکیریں لیے ماحول کو سحر زدہ بنا رہے تھے۔

وہیں اندرونی محرابی برآمدے کے مرمریں ستونوں سے ٹیک لگائے دونوں بازو سینے پر باندھے وہ سوچوں میں گم سامنے دیکھ رہا تھا۔

شیخو مؤدب سا اس سے جانے کب ٹرے میں چائے کے خوبصورت شفاف برتن سجائے وہیں چلا آیا۔ برآمدے کے آخری کونے میں کین کی خوبصورت کرسیوں اور شیشے کی میز کے قریب رک کر وہ استفسارانہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "ہاں یہیں رکھ دو"۔ وہ ملائمت سے بولا۔ "نعیم صاحب کو بھی بتا دو"۔ وہ دو قدم چلتا کرسی تک آ آیا۔

"صاحب وہ بازار گئے ہیں۔ کہتے تھے سبزی کا کام ہے۔ آپ آرام فرما رہے تھے تب"۔

"ہوں"۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اور بیر خالی ٹرے لیے مؤدب طریقے سے مڑ کر دو محرابی برآمدے کے

آخری بسکٹ پر سیٹھ عیاں اتر گیا۔

چائے پیتے ہوئے بھی اس کی نظریں سُرمئی بادلوں پر سُرخی مائل سنہری بیلوں پر اور پہاڑی کے پیچھے چھپتے سورج پر جمی ہوئی تھیں۔

چائے کے دوسرے کپ میں چینی ملاتے ملاتے وہ یکبارگی چونکا۔ دائیں طرف سامنے ہی سبزیوں کی کھیتیوں کے آخری کنارے جدید کوٹھی کے ٹیرس پر سے ایک ہلکا سا چھوٹا سا قہقہہ اُبھرا تھا۔ جیسے پریوں کے دیس کی گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں۔ بادلوں میں پوشیدہ نرم و نازک پروں والی گھنٹیاں۔ وہ ادھر ہی دیکھنے لگا۔ اُنہی مخصوص لوہے کی سفید تار والی کرسیوں میں سے ایک پر وہی اُس شام والی بھاری بھرکم گورنس نما عورت۔ اس طرف پیٹھ کئے۔ نیچے بہتی ندی کی طرف رُخ کئے بیٹھی تھی۔ جبکہ۔

ہنوز ہنستی گلابی گلابی سی ایک بے حد نازک سی لڑکی اس کی طرف رُخ کئے بالکل سامنے ہی بیٹھی تھی۔

کامران کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یہ یقیناً مس فضیح احمد تھی۔ اتنے دنوں میں وہ آج پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اور بھاری جسم والی عورت۔ وہ بھی یقیناً اس کی گورنس وغیرہ تھی۔

اُس نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ خالی کپ میز پر رکھا اور آہستہ سے کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

برآمدے کے آخری کونے کی سیڑھیاں اترتا وہ لان کے کنارے چلتا سبز بیلوں سے نکل رستے آگیا۔ اب وہ ان کے ٹیریس سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ ایک لمحہ کو وہ جھجک سا گیا۔ ٹیریس کے اتنے قریب جانا اُسے بعید از اخلاق معلوم ہوا۔

لیکن پھر۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔ لب شرارت سے پھڑپھڑا اُٹھے۔ اور قدم۔ دوبارہ۔ آہستہ آہستہ ٹیریس کے قریب تر ہونے لگے

"ہیلو آنٹی"۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے بھاری جسم والی عورت کو نہایت معصومیت سے مخاطب کیا۔

"جیتے رہو بیٹے"۔ گورنس نظر کا چشمہ اس پر فوکس کرتے ہوئے بے اس تخاطب سے کھل ہی تو اُٹھیں۔

"مزاج کیسے ہیں؟"۔ وہ ایک اُچٹتی نظر کا پنچ ایسے بدن والی مس فصیح احمد پر ڈالتے ہوئے بولا

"اللہ کا فضل ہے۔ تم سناؤ بیٹے۔ دل لگ گیا یہاں"۔ وہ بانٹنے سے لئے اون سلائیاں قریبی میز پر رکھتے ہوئے گویا مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"جی۔ جی دل۔ جی بالکل لگ گیا۔" مس فصیح احمد کی آنکھوں میں دلیری سے جھانکتے ہوئے وہ گورنس کی نظریں صاف بچا گیا۔

اور مس فصیح بُری طرح پہلو بدلنے لگی۔

"ڈی سی صاحب کے فرزند ہوں گے آپ ؟" گورنس نے مسز فصیح احمد کی طرف توبہ دیتے بغیر پھر سلسلہ جوڑا۔ وہ شمر سے بس اتنا ہی تو لگتا تھا۔

"جی ؟" ۔ وہ چکرا سا گیا۔ ایک نظر مسز فصیح احمد پر ڈالی۔ وہ ایسے ہی جزبز ہو رہی تھی۔ "جی ہاں۔ بجا پہچانا۔ آپ نے۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ"۔ اب کے گورنس نے عینک کا زاویہ پھر بدلا۔ سر سے کر پاؤں تک اُسے گھورا۔

لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ وجیہہ شکل وصورت۔ بلاشبہ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔

"نام کیا ہے بیٹے ؟"

"جی۔ وہ۔ نعیم ۔۔۔"۔

"پڑھتے ہو گے ؟ یا پڑھ چکے ہو ؟"۔ گورنس کو پاس بیٹھی لڑکی کی کوفت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ تو آج ہی اُس کا پورا انٹرویو لینے پر تلی نظر آ رہی تھیں اور کامران ۔

اُس کا تو گویا دلی مقصد حل ہو رہا تھا۔

ایک پل کو سوچ میں پڑ گیا۔

"جی پڑھ رہا ہوں ابھی"۔ وہ مزید معصومیت سے بولا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتے ہو ؟"

"بی۔ اے ہیں" ۔ وہ انکسار سے بولا۔

"بی۔ اے ہیں؟" ۔ وہ شاید ٹھیک سے سن نہ پائی تھیں ۔

"جی۔ دراصل ۔ ۔" اس نے پھر ایک نظر لڑکی کی متحیر آنکھوں میں دیکھا۔

"میں فیل ہو گیا تھا" وہ سبزی کے گرد لگی بار کی پتیاں توچتے ہوئے بولا۔ "ملک سے باہر سیر کے لیئے گیا تھا۔ واپس آیا۔ امتحان میں دن تھوڑے تھے ۔ بس فیل ہو گیا۔" گورنس کی نظر میں بچا بچا کر سس نصیح احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی سٹ پٹاہٹ سے دِل ہی دل میں محظوظ ہوتا وہ بتاتا گیا ۔

"کوئی بات نہیں بیٹے اس دفعہ پاس ہو جاؤ گے ۔ ہمت نہیں ہارنا چاہیئے" ۔

"جی بجا فرمایا ہمّت نہیں ہارنا چاہیئے۔" وہ مزید انکسار سے بولا۔

"کتنے بہن بھائی ہو بیٹے؟"

"دو بہنیں بڑی ہیں ۔ ایک مجھ سے چھوٹی ہے ۔ ۔ ۔"

"گھر بار والی ہوں گی؟"

"جی دو کی شادیاں ہو چکی ہیں ۔ اور" ۔ ۔

"اور تم ۔ ۔ ۔ ؟" جانے وہ کیا پوچھنا چاہتی تھیں؟

"جی ۔ میں ابھی غیر شادی شدہ ہوں ۔" اس نے عجیب سی نظروں سے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا ۔

جسے برداشت نہ کرتے ہوئے وہ کرسی پر سے اُٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور کامران کا جی چاہا اتنے قہقہے لگائے اتنے قہقہے۔ کہ دونوں کو ہٹیاں تو کیا پہاڑ اور آسمان بھی گونج اُٹھیں۔

بڑی آئی تھی نفرت کرنے والی۔ اس کے کسی منفیہ جذبے کی تسکین ہی جیسے پیدا ہوئی تھی۔

"بیگم صاحبہ بھی آئی ہیں؟" کورنس نے مزید پوچھا۔

"امی چند ماہ بعد آئیں گی۔ فی الحال صرف میں آیا ہوں۔" وہ پہلی بار سنجیدگی سے بولا۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ" کورنس پھر گویا ہوئیں۔ جانے کیوں وہ اُس کی شخصیت سے مرعوب ہوتی جا رہی تھیں۔

"جی آپ اب زندہ رہیں" وہ اب پھر بُردبار لگ رہا تھا۔

"اللہ عمر دراز کرے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔" اُس نے جو اتنی عزت کے ساتھ گفتگو کی تھی اُن کے ساتھ۔

قدم آگے کی طرف بڑھاتا دھیرے دھیرے چلتا وہ اپنی سیڑھیاں اُتر کر نیچے ندی میں اُترنے لگا۔

اتنے لمبے چوڑے ثقیل سے نام کے برعکس —

اُس نے غیر معمولی نزاکت پائی تھی۔ وہ بے پناہ خوبصورت تھی۔ کا رُخ

ایسا نازک مرمریں جسم۔ گلابی شفاف رنگت۔ شربتی آنکھیں۔ لمبے سنہری بال۔
بے حد خوبصورت نقوش۔ اور غضب کا متناسب جسم تھا۔
اٹھارہ۔ اُنیس عمر ہوگی۔ مگر چہرے پر اس قدر معصومیت تھی۔ کہ مشکل
سے پندرہ سولہ سال کی لگتی تھی۔ اس قدر نازک تھی۔ اس قدر شفاف۔ کہ اُسے
دیکھتے ہی جانے کیوں؟۔

اچانک ہی اُس کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ اُسے دو انگلیوں میں اٹھا سکتا
تھا۔ مگر۔

ساتھ ہی یہ بھی کہ ہاتھ لگنے سے واقعی اس کے میلے ہو جانے کا امکان تھا۔
ٹیلیفون پر اُس کے غیض و غضب کے برعکس اُس کی نظریں کبھی حیا سے
جھک جاتیں۔ کبھی ناراض سی نظر آنے لگتیں۔ پھر کبھی سہمی سی اور کبھی شاید
مشتعل سی لگنے لگتی تھیں۔

وہ واقعی اُس کے خیال کی طرح تھی۔ ایک مفروضہ خیال۔ جو حقیقت کا
روپ دھار گیا تھا۔

دُور پانیوں پر نظریں جمائے وہ اُسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اور پھر
اچانک ہی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔ پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر قبل اُس
نے کیسی زبردست ایکٹنگ کی تھی؟۔

کیسی اوٹ پٹانگ ہانک کر آیا تھا۔ اور کیسے وہ اُسے سچ مچ کا لوفر سمجھ کر اٹھ کر اندر چل دی تھی۔

اُس نے بھی تو حد کر دی تھی۔ جب بھی اُس کی طرف دیکھا تھا۔ خالص غنڈوں والی نظروں سے دیکھا تھا۔

" آپکا نام لوفر ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" اُس کے آواز کی بازگشت اُس کے کانوں میں آئی۔

" بہت اچھا کیا تھا اُس نے بھی"۔ وہ اپنے کئے پر ذرا بھی پشیمان ہوئے بغیر واپس اوپر آ گیا۔ بخراب کے سن روم کی طرف بادام کے باغ کے ساتھ چلتا کچن کے آگے سے گزرتا وہ بائیں طرف سلیٹ نما پتھروں والی سیڑھیاں پر اوپر چڑھنے لگا۔

آخری ٹیرس پر پہنچ کر وہ سنگ مرمر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ تمام اطراف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بل کھاتی سڑک بھی جس پر ابھی نعیم نے واپس آنا تھا۔ اور وہ

شدت سے نعیم کا منتظر تھا۔ آج کی اپنی آوارہ گردی بلکہ بقول کسی کے اپنی "لوفری" کی اُسے رپورٹ دینا تھی۔ اپنے انٹرویو کا حال سنانا تھا جس کے لئے اُس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ اور جس میں پھر بھی کامیابی کی منزل اُسے سامنے نظر آ رہی تھی۔

"ڈی سی صاحب کے فرزند ہوں گے آپ؟" اُسے اچانک یاد آیا۔ اور پھر قریبی میز پر سر ٹیک کر وہ بے اختیار ہنس دیا۔ گورنس نے اس کی سوچ کو اِک نئی راہ دکھائی تھی۔

۵

"مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگا ماما" کمرے کی کھڑکی میں سے اُسے واپس اندر کی طرف جاتے دیکھ کر وہ واپس ٹیرس پر آکر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہائیں بیٹی" - ماما کے تیزی سے سلائیاں بنتے ہاتھ رک گئے۔ "وہ تو بہت ہی نیک لڑکا لگتا ہے۔ مجھ غریب کو دیکھو کیسی عزت سے مخاطب کرتا تھا"۔

ماما کو تو جیسے اس کی باتوں نے خرید ہی لیا تھا۔

"کچھ بھی ہو..." وہ جزبز سی ہو کر رہ گئی۔

کچھ دیر قبل کی اس کی بے باک نظریں اسے یاد آگئیں۔

"آپ اسے زیادہ منہ مت لگایا کریں"۔

"لو بیٹا۔ اب یہاں تک آ ہی گیا تھا۔ تو میں کیا کرتی۔ پھر اس نے کوئی ایسی بری حرکت بھی نہیں کی"۔

"اتنا قریب آنے کی کیا ضرورت تھی؟"۔ وہ بڑبڑائی۔

"اُس کے اپنے گھر کے حدود میں بیٹی ہم اُسے منع تھوڑی کرسکتے ہیں۔ پھر کوئی ایسا ویسا تو ہے نہیں۔ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اچھے گھرانے کی اولاد ہے۔"

"اچھے گھرانے کی اولاد اس طرح ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے" اس نے فوراً ہی بات بدلی۔ اُس کی بے باک نظروں کا ماما کو کیونکر کہتی "امتحان میں دن تھوڑے تھے۔ تو باہر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہی ٹھاٹھ باٹھ ہیں۔ جبھی تو فیل ہوتا رہا ہے۔ اور پھر کتنی ڈھٹائی سے بتا بھی رہا تھا۔"

"میں تو کہتی ہوں بیٹی! صاف گوئی سے بہتر کوئی چیز نہیں کتنی سچائی سے ہر بات بتا رہا تھا۔ کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ اُس کی باتوں میں۔"

"آپ تو ہر ایک کو اچھا سمجھ لیتی ہیں" وہ پھر دھیرے سے بڑبڑائی۔

وہ ماما کی عادت سمجھتی تھی جس کو ایک دفعہ اچھا سمجھ لیا بس سمجھ لیا۔

"نہیں بیٹی! انھیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ یقیناً شریف لڑکا ہے۔"

"بابا جان نے خواہ مخواہ ہی پروگرام اتنا لمبا کرلیا ہے۔ بیچ میں ہفتہ بھر کے لئے چکر لگا جاتے تو اچھا تھا۔" اُس نے بات کا موضوع یکسر ہی بدل دیا۔

"شاید ایسا ممکن نہ ہو"۔ ماما بولیں۔

"اس بار مجھے شدّت سے انکا انتظار تھا۔" وہ کچھ اُداس سی بولی۔

اُسے ہمیشہ ہی بابا جان کا شدّت سے انتظار رہتا تھا۔ ممّی کا وہ چھوٹی سی تھی تو انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے فصیح احمد اُسے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ماما

ممّی کی زندگی میں بھی اُس کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ بعد میں تو اُسے حقیقی اولاد سمجھ کر پالا۔ خود بچاری بیوہ بے اولاد تھیں۔ اس کو ہی اپنی کل کائنات سمجھ لیا تھا۔

وہ چھوٹی تھی۔ تو باباجان اُسے بیرونِ ملک بھی ساتھ ساتھ لئے پھرتے تھے۔ پرائمری تعلیم بھی وہیں دلوائی۔ مگر دس سال کی ہوئی تو باہر کا ماحول انہیں اس کے لئے مناسب نہ لگا۔ ہر چند کہ وہ بے جا پابندیوں کے قائل نہ تھے۔ مگر اپنے مشرقی اقدار انھیں بہرحال عزیز تھے۔ اور یہی اقدار اپنانے اور قائم رکھنے کے لئے اُنہوں نے اُسے وطن میں ہی گورنس کی حفاظت میں دے دیا۔
خود کبھی یہاں کبھی وہاں۔ مختلف ممالک میں اپنے وسیع کاروبار کے سلسلے میں جاتے رہتے۔ اس کی چھٹیوں کے لئے البتہ اُن کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ ملک میں رہیں۔ اور یوں تین ماہ کی چھٹیاں باپ بیٹی اپنے آبائی گاؤں میں گزارنے چلے جاتے۔ متصل اپنی جائیداد کی جانچ پڑتال کرتے۔ اور وہ گاؤں کے ماحول سے لطف اٹھاتی۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ سکول سے کالج میں آگئی۔ اور اب وہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ مہینہ دو بعد سالانہ امتحان ہونے والے تھے۔ پھر وہ فارغ ہی فارغ تھی۔ ہمیشہ کی طرح اُسے اس بار بھی گاؤں جانے کی جلدی تھی۔ سردی کی چھٹیاں وہ وہیں باباجان کے ساتھ گزارا کرتی تھی۔ وہاں کا موسم یہاں

سے اچھا تھا۔ ٹھنڈ وہاں بھی خاصی ہوتی تھی۔ مگر یوں منجمد کرنے والی نہیں تھی۔
چند دن قبل وہ بے حد خوش تھی۔ بابا جان اپنے پروگرام کے مطابق یہاں
سے پہنچنے والے تھے۔ مگر پھر آنے کی بجائے انہوں نے اچانک ہی فون پہ
اُسے بتایا کہ وہ تین ماہ مزید نہ آسکیں گے۔ وہ بے طرح اداس ہو گئی تھی۔
پھر ماما اُسے اُس کی دوست صوفیہ کے یہاں لے گئی تھیں۔ پکچر دکھا لائی تھیں
ہر طرح سے مصروف رکھا تھا۔ اور پھر وہ بھی بہل ہی گئی تھی۔
"آجائیں گے بیٹی۔ تم دل تھوڑا کیوں کرتی ہو۔ تین مہینے یوں چٹکی بجاتے
میں گزر جائیں گے"۔ وہ واقعی چٹکی بجاتے ہوئے بولیں۔
اور وہ خوبصورتی سے مسکرا دی۔ ماما اس کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔
"ماما میرا یونیفارم آگیا ہے۔ دھوبی کے یہاں سے؟"۔ اُسے اچانک
ہی خیال آیا۔ آج اُس کی چھٹی تھی۔ سارا دن یاد ہی نہیں رہا تھا۔
"ہاں صبح ہی دھوبی کپڑے لایا تھا۔ میں نے تمھارے وارڈروب میں
ہینگر میں ڈال دیئے ہیں"۔
"شکریہ ماما۔ بوٹ بھی پالش ہو گئے ہیں؟"۔ اُس نے مزید پوچھا۔
"وہ بھی تمہارے شو ریک میں رکھے ہیں"۔
"شکریہ" وہ پھر بولی۔ اور
وہ یکبارگی زور زور کے مردانہ قہقہوں سے چونک اٹھی

"جوانی بے فکری ہوتی ہے"۔ ماما لہجے میں شفقت لئے پیچھے مڑ کر قدیم کوٹھی کے سامنے والے بیڈ روم سے آتے قہقہوں کی سمت دیکھتے ہوئے زیرِ لب بولیں۔ "بچے ہیں ابھی ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں"۔ وہ واپس رُخ پھیر کر سلائیاں بننے لگیں۔

"خاک بچے ہیں"۔ وہ جانے کیوں؟ ماما کی بے جا طرفداری برداشت نہ کر سکی۔ "چھ فٹ کا قد اور ابھی بچہ ہے"۔ وہ بڑبڑائی۔

اُسے پیڑلیس کے قریب آتے دیکھ کر اُس کے قد اور شخصیت سے واقعی مرعوب ہوئی تھی۔ اُس نے اُس کی آنکھوں میں دلیری سے دیکھا تھا تو وہ کچھ سہم سی بھی گئی تھی۔ مگر۔ پھر۔ وہ شادی کا ذکر کرنے لگا تھا۔ تو کیسی بے باک نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اُسے پھر اُسکی بے باک نگاہیں یاد آگئیں۔

"قد سے کیا ہوتا ہے بیٹی۔ یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے"۔

"اچھا ماما۔ آپ کہتی ہیں تو ہوتا ہوگا"۔ اُسے ماما کی ممتا کے آگے سپر ڈالنے ہی پڑتے۔ وہ سمجھ گئی تھی، وہ ماما کو کم از کم اس آدمی کے بارے میں قائل نہ کر سکے گی۔ "میں تھوڑا ہوم ورک کروں گی۔ صوفیہ سے فون پہ بات بھی کرنی ہے"۔ وہ کرسی پرے کھسکاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی

اور ماما کامران اور نعیم کے جاندار قہقہے سُن سُن کر ممتا نچھاور کرتی رہیں۔

٦

تین سو میل لمبا اور کچی سڑک والا راستہ طے کر کے اس کی جیپ کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ آج پورے چار دن کے دورے کے بعد وہ گھر پہنچا تھا۔ تمام کپڑوں اور بالوں پہ دھول جمی ہوئی تھی۔ تھکا تھکایا سادہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف گیا۔

"ہیلو کامران" نعیم نے اُسے کوریڈور میں آلیا۔ "سناؤ کیسی رہی ٹرپ؟"

"کچھ نہ پوچھو۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے ایک تو راستہ۔ راستہ تو شاید وہ نہیں تھا۔ جیپ خود ہی بچاری راستہ بناتی آرہی تھی۔ اوپر سے جیپ کی سواری"۔ وہ ہاتھ میں پکڑا بریف کیس اور پستول الماری میں رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ پکی ہمیں سڑکوں کے عادی ہو۔۔۔۔"

"ہو بہت ہوشیار۔ صاف کنی کترا گئے"۔ وہ ہنستے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھا۔

"میں نے تو صاف کہہ دیا تھا۔ ایسی غیر رومینٹک جگہ جانا اپنے بس کا روگ نہیں ہے"۔

"نہا کر آتا ہوں۔ پھر باتیں ہوں گی"۔ وہ ڈریسنگ روم سے ہوتا باتھ روم

میں گھس گیا۔

گرما گرم پانی کا شاور لیا۔ تو طبیعت خوش ہو گئی۔ بڑا سا تولیہ لپیٹ کر وہ ڈریسنگ روم میں آیا۔ گرم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے۔ نرم اون کی گرم پل اوور پہنی۔ گرم جرابیں پہن کر چپل پہنے۔ تو لیے سے سر اچھی طرح رگڑا۔ اور کمرے میں آگیا۔ نعیم پہلے سے اس کے بستر میں گھسا منتظر بیٹھا تھا مسکراتے ہوئے کامران بھی پاؤں کی طرف سے گھس گیا۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور اجازت پاتے ہی بیرا چائے کی ٹرے اندر لے آیا۔ میز بستر کے قریب لاتے ہوئے بیرے نے وہیں برتن رکھ دیئے۔ اور خالی ٹرے لے کر واپس چلا گیا۔ "تقریباً پچاس میل پرے سے میرا دل شدت سے چاہتا تھا۔ کوفی کا ایک گرم گرم کپ مل جائے۔"

"دیکھو کامران! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے۔ یہاں کوفی۔ کوکو کا ذکر مت کیا کرو۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ یہ نازک نازک چیزیں نہیں جانتے۔" نعیم پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے حسبِ عادت گویا ہوا۔

"میں آج ہی ساری چیزیں منگوا لوں گا۔ اور پھر خود بنایا کروں گا۔ دوسرے کے ہاتھ کی بنی بھی کوئی کوفی ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتی۔ سمینہ بڑی زوردار کوفی بناتی ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"اُسے بھی میں نے سکھائی ہے"۔

"اِسی لئے گھونٹ بھرتے ہی مُنہ کا ذائقہ کڑوا ہوجاتا ہے۔"

اور کامران دھیرے سے ہنس دیا۔

"میرا دِل چاہتا ہے۔ Cheese pie بناؤں۔ ڈھیر ساری چوکلیٹ بناؤں۔ سینڈوچیز بناؤں اور مختلف قسم کے سلاد۔۔۔"

"یہ ارمان یہاں تو پورے ہونے سے رہے۔"

"نہیں۔ خود کبھی کبھی ضرور کچھ پکایا کریں گے۔ کبھی کبھی کُک کی چھٹی کروا دیا کریں گے۔ ورنہ پھر تو۔ عجیب اجنبی سا ماحول لگا کرے گا۔ یہ کیا کہ اپنے کچن کے اندر بھی نہ جا سکو۔ اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہ سکو۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھو۔ سوائے ہوسٹل میں سوجی کے حلوے کے اور میں نے کچھ نہیں سیکھا۔ ہاں انڈے بھی بنانا جانتا ہوں۔" پھر جیسے اُسے یاد آیا "یار نعیم! امریکہ میں وہ گرل فرینڈ کچھ نہیں بنا کر دیتی تھی؟ سب خود کرتے تھے؟"

"میری کون سی گرل فرینڈ تھی وہاں؟" نعیم کی اچانک ہی ٹیپڑی بدلنے والی بات پر وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میرے پاس تمہارے کئی خط موجود ہیں جن میں تم نے اس کا ذکر کیا ہے۔"

"ہاں تھی تو۔ ایک نہیں۔۔۔ دو تین تھیں۔۔۔ مگر۔۔۔" وہ کچھ سوچتے سوچتے مسکرا دیا۔ "یہ تمہاری پڑوسن کا کیا حال ہے۔؟" اس کا اشارہ مس فصیح احمد کی طرف تھا۔

"پڑوسن میری یا تمہاری؟" نعیم اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

" دونوں کی - یار ... چائے گرجائے گی "۔ اس نے جلدی سے کپ میز پہ رکھدیا۔

" صرف تمھاری - میں نے اُس کی خاطر دس ٹن کی گورنس کو آنٹی نہیں بنایا۔ نا ہی میں اُسکی خاطر بی اے میں فیل ہوا ہوں - اور نا ہی ڈی سی کا بیٹا بنا ہوں "۔

" یہ سب میں نے خود تھوڑی کہا تھا - بس کچھ موقعہ ایسا تھا - کچھ مجبوری ایسی تھی -

... اور پھر تم نے گانوں کے وہ بول ٹیپ کروا لیئے جو میں تمہیں لکھا کر گیا تھا ؟ "۔

" ہاں - پر اُن کا کروگے کیا ؟ "

" دیکھنا کیا کرتا ہوں " وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا " اچھا تیا نظر آئی تھی وہ اتنے دنوں میں ؟ "

" میں تمہاری طرح تاک جھانک کا قائل تو نہیں - البتہ سامنے کے ٹیرس پر پتلی اور موٹی دونوں EXTREMS اکثر شام کو نظر آجاتی تھیں - ویسے ہاتھ تم نے اچھا مارا ہے - لڑکی خوب صورت لگتی ہے "۔

" میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں - یہ تو بس اُسے ذرا تنگ کروں گا - کیوں ایک شریف آدمی کو بلا تحقیق کوئی " لوفر " کہے - تب تو مجھے اتنا غصہ آیا تھا کہ سامنے ہوتی تو ... " " تب بھی پیار کر لیتے "۔

" سوری - میرا آئندہ بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں - اگر وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے تو اپنے لئے - دوسروں کے ساتھ بہر حال تمیز سے پیش آنا چاہیئے "۔

وہ خالی پیالی رکھ کر کمبل اپنے گرد لپیٹتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

" سُنا ہے بہت اچھے لوگ ہیں؟"

" میں نے بھی سُنا ہے مسٹر فصیح احمد بہت شریف ملنسار اور نیک انسان ہیں۔ لیکن ۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ باپ اچھا آدمی ہے تو بیٹی کیوں دوسروں کی بے عزتی کرتی پھرتی ہے"۔

" بھئی تم تو سنجیدہ ہو گئے ہو"۔

" نہیں خیر اتنا بھی نہیں"۔ وہ مسکرایا " لیکن ہوں ضرور ۔ میں اپنی بلا وجہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا "

" میں تو کہتا ہوں اب اُسے معاف ہی کر دو " نعیم نے بھی خالی کپ واپس رکھ دیا۔

" ابھی میں نے کیا کیا ہے؟ صرف تعارف ہی تو کروایا ہے اپنا "

" اچھا چھوڑ ۔ یہ بتا کیا کیا کھا کر آ رہے ہو؟"

" دُنبے ۔ دنبے اور دنبے ۔ بس "

" تو آدھا دنبا چھپا کر ساتھ بھی لے آتے "۔

" آدھا تو نہیں پُورا ضرور ساتھ لایا ہوں ۔

" وہ کیوں ؟" ۔

" بس پیارا لگا تھا ۔ دنبے کا بچہ ہے معصوم سا ۔ روئی کے گالوں کی طرح"۔

"دیکھو بات سنو۔ یہ پیار اِدھر اُدھر بیکار مت لٹاؤ۔
سامنے ہی مستحق بندہ رہتا ہے۔ اُس کی نذر کر دو"۔
"دھت تیرے کی"۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "اپنا دبّہ مجھے اُس سے
ہزار درجے زیادہ پیارا ہے INNOCENT سا جانور"۔
"جانور تو وہ بے شک نہیں ہے۔ لیکن کیا وہ INNOCENT بھی نہیں ہے"
"مجھے نہیں معلوم"۔ وہ کہنی کے بل دراز ہوتے ہوئے بولا۔
جبکہ وہ جانتا تھا۔ کہ وہ بے حد معصوم تھی۔
"یہیں سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ضرور وہ معصوم ہے"
"ہے بھی تو کوئی فرق نہیں پڑتا"
"یعنی کہ تم ضرور اُس سے بدلہ لو گے"۔
"ہاں"۔ اُس نے خوبصورت پلکوں کو اثبات میں جنبش دی۔
"کل مجھے تمہاری آنٹی نے اشارے سے اپنے پاس بلایا تھا" نعیم اچانک
بولا۔
"تو؟"۔ وہ چونک کر متوجہ ہو گیا۔
"میں چلا گیا"۔
"پھر؟"
"تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ اور دیکھو" اُسے اچانک یاد آیا "تم نے انہیں اپنا

نام نعیم بتایا ہے ؟"

"کیوں؟" وہ زور سے ہنس دیا۔

"چھوٹتے ہی ڈسٹن کی آنٹی نے کہا۔ "بیٹا! نعیم کہاں ہے؟" نعیم نے گورنس کے لہجے میں اُس کی نقل اُتاری۔

"پھر تم نے کیا کہا؟" کامران گھبرایا سا لگنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں سمجھ گیا تھا یہاں بھی تم نے گل کھلایا ہے۔ میں نے کہہ دیا پشاور گیا ہے۔

"اوہ۔ یہ اچھا کیا" کامران مطمئن ہو کر پھر لیٹ رہا۔

"تمہاری" اُس" کو بھی دیکھا"

"پھر ؟ ہی؟" کامران نے پاؤں مار کر اُسے پرے دھکیل دیا۔

"سنو تو"۔

"ہوں"۔

"بہت خوبصورت ہے"

"تو میں کیا کروں؟"۔

"بس وہ لوفر والی بات دل سے نکال دو"۔

"تم کیوں سفارش کر رہے ہو؟"۔

"تمہارے لئے۔ میرا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے"

"میرے لئے کیوں؟"

"تو کیا تمھیں کسی لڑکی کی ضرورت نہیں؟"

"فور گوڈ سیک۔ اتنا عرصہ کیا میرے ساتھ لڑکیاں رہی ہیں۔"

"لیکن اب تو ہونی چاہیئے نا"۔

"کیوں آخر؟"

"بھئی شادی کا بھی تو سوچنا ہے نا تمھیں"۔

"اوہ۔تو تمھیں یہ فکر تھی؟"

"اور کیا؟"۔

"کوئی اور ڈھونڈ دو"۔ وہ لجاجت سے بولا۔

"جب سامنے مل رہی ہے تو دور جانے سے فائدہ؟"

"مجھے نہیں چاہیئے یہ"۔

"کیا برائی ہے اس میں؟"

"تمھیں معلوم ہے"۔

"اس کے باوجود کیا وہ تمھیں متاثر نہیں کرتی؟"

"بالکل نہیں WILL POWER ہونی چاہیئے"

"میں تو اُسے تمھارے لئے پسند کرکے آ بھی گیا"

"کیا مطلب؟" وہ برہم نظر آنے لگا۔ نعیم سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

"دل ہی دل میں یار"۔ وہ آرام سے بولا۔

"تم ضرور کسی دن گڑبڑ کرو گے"۔ اُسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا"۔ اُسے کامران کی ہٹ دھرمی اچھی نہ لگی۔ خواہ مخواہ ایک چھوٹی سی بات کو طول دیے جا رہا تھا۔ "تمہاری WILL POWER ہونی چاہیے"۔ اُس کے لہجے میں خواہ مخواہ طنز سا مل گیا۔

"میری WILL POWER اپنی جگہ ہے لیکن تم کیوں ناراض ہو رہے ہو؟"

"ناراض نہیں ہوں لیکن میں دوسری بھی نہیں ڈھونڈ سکتا"۔

"میں تو ڈھونڈ لوں گا"۔

"اِسی کو؟"۔ وہ حسبِ عادت بول پڑا۔

"اونہہ"۔ کامران نے مسکراتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

آج ساری دوپہر کی زبردست محنت و مشقت کے بعد وہ واقعی بہت لذیذ Cheese Pie بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اُس کی پسندیدہ ترین ڈشوں میں سے ایک تھی۔ گیس کے چولہے پر مزیدار سی چائے بن چکی تھی۔

"ٹرے میں برتن لگا دیے؟"۔ اُس نے پیچھے مڑتے ہوئے نعیم سے پوچھا۔

" لگا دیتے "۔ وہ چائے کے چمچ ٹرے میں رکھتے ہوئے منہ پھلائے پھلائے بولا۔

" آؤ یہ چائے بھی رکھ لو۔" کامران کیتلی سے چائے چائے دانی میں انڈیلتے ہوئے بولا۔" میں اوون سے پانی نکالتا ہوں"۔ وہ اوون کی طرف جھکا۔

" ہوں"۔ اس نے چائے دانی اٹھاکر ٹرے میں رکھ دی۔

" اوپر سے ٹی کوزی کردو"۔ اسی طرح جھکے جھکے اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹی کوزی اٹھاتے ہوئے اس کی طرف اچھالی۔

" کور کردیا ہے"۔ وہ مزید ناراضگی سے بولا۔

" اب تو موڈ ٹھیک کرلو۔ پائی اچھی بن گئی ہے" وہ گرما گرم سنہری پائی ڈش میں اٹھائے ٹرے کی طرف بڑھا۔

" میں کہتا ہوں یہ سب کُک نہیں بنا سکتا تھا۔ ساری دوپہر غارت کردی۔ ضروری خط لکھنا تھا"۔ وہ بڑبڑایا۔

" کُک یہ پائی بنانا نہیں جانتا تھا۔ میں نے پوچھا تھا اس سے۔ اور دوپہر کیا خط لکھنے کے لئے ہوتی ہے؟"۔ کامران ٹرے دونوں ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

" تم تو ہو ہی کورے۔ دوپہر کو جس سکون سے خط لکھا جا سکتا ہے۔ وہ کسی اور وقت میں ممکن نہیں ہوتا"۔ نعیم اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے اس

کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔

"یہ اتنے گہرے سکون کی ضرورت کیوں پیش آگئی ہے"۔

"بس آگئی"۔ وہ ہنس دیا۔

"مجھے معلوم ہے سمیعہ کو تکتے رہتے ہو"۔ وہ برآمدے میں چلتے ہوئے بولا۔

"وہ بھی تجھے تکتی رہتی ہے"۔

"میں برا تو نہیں مانتا۔ کچھ دونوں بہن بھائی ہو آپس میں"۔

"بدمعاش"۔ نعیم نے ہوا میں مکا لہرایا۔

اور کامران نے آگے بڑھ کر برآمدے کے آخری کونے میں اپنے بیڈ روم کے قریب رکھے میز پر پڑے رکھدی۔

"ہم بہن بھائی ہیں ؟"۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کزنز ہوتے ہی بہن بھائی ہیں لاکھ نکاح ہو جائے"۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ "کزن سے منگنی شادی۔ میں تو حیران ہوتا ہوں۔ کیسے ذہن و دل تیار ہو جاتے ہیں ؟"۔

"جبھی کزن کے علاوہ تاک جھانک ہو رہی ہے"۔ نعیم نے چھری سے پائی کاٹتے ہوئے دائیں رخ پیڑیس کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔

"پلیز!"۔ کامران اپنے لئے چائے بناتے ہوئے اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "میری سوچ بھی اس طرف نہیں جا سکتی"۔

"سورج پرکس کا پہرہ ہوتا ہے؟" -

"میں پہرے لگا سکتا ہوں۔"

"تم پہرے دار بلاؤ۔ میں پائی کھا رہا ہوں۔ ویسے بنی بہت لذیذ ہے واقعی اچھے لگ ہو۔ مزے ہوں گے بی پڑوسن کے۔ بڑے بڑے اتنی بہترین پائی مل جایا کرے گی۔"

"بکتے جاؤ۔" وہ بھی پائی کے مزے لیتے ہوئے بولا۔

"میری بات کو مذاق مت سمجھنا۔ میں جو پیشن گوئی کرتا ہوں ہمیشہ ٹھیک نکلتی ہے۔"

"اس سال پاس ہو جاؤ گے؟" کامران نے اچانک پوچھا۔

اور نعیم کی زبردست ہنسی چھوٹ گئی۔

"وہ دیکھ تیری پڑوسن ٹیرس پر تشریف لے آئی۔" کامران نے ایک دم ہی کہا۔

نعیم نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خوبصورت کمونو ڈریس پہنے لمبے بال پشت پر کھلے چھوڑے چند کتابیں ہاتھ میں لیے وہ بیٹھنے کی تیاری کر رہی تھی۔ بیٹھتے بھی اس رخ ہو جہاں سے پڑوسن کا دیدار ہو سکے۔ اور پھر مسکرا بھی ہوتے ہو۔"

"کمونو پہنے اچھی لگ رہی ہے۔" کامران مزید بولا۔

جبکہ اس میں شک بھی نہیں تھا۔ ریشمی اودی پھولدار کمونو پہنے سنہری لمبے بال پشت پر لہرائے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

"کامران!"۔

"جی"۔ وہ مودّب طریق سے بولا۔

"تمہیں یہ لڑکی واقعی اچھی نہیں لگتی؟"۔

"قطعی نہیں"۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"۔

"یعنی میں کوشش کرکے اسے پسند کرلوں؟"

"ہاں"۔

"لیکن کیوں؟"۔

"گھر اچھا لڑکی اچھی ہے"۔

"تم ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ میں یہ پائی اسے چکھا کر آتا ہوں"۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چھوڑ یار" نعیم نے پلیٹ واپس جھپٹ لی "پسند بھی نہیں ہے۔ پائی بھی دینے جارہے ہو۔ ہم نے ابھی کھائی ہی کتنی ہے؟"۔

"تمہیں معلوم ہے میں کیوں ایسا کررہا ہوں"۔

"سب بہانے ہیں"۔

"کوئی بہانہ نہیں ہے"۔ وہ آدھی پائی نعیم کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے باقی اٹھالے گیا۔

اور پھر بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہ وہاں جا پہنچا۔
جانے کیوں؟ لڑکی اسے اکیلے میں دیکھتے ہی گھبرا سی گئی۔ وہ دل ہی دل میں محظوظ ہوا۔
"یہ پائی کھائیے میں نے خود پکائی ہے"۔ وہ بغیر کسی تمہید کے پلیٹ اس کے آگے والی میز پہ ہاتھ لمبا کر کے کھسکاتے ہوئے بولا۔
"شکریہ۔ میں نہیں کھاؤں گی"۔ وہ کتاب کھول کر خالی خالی نظریں سطروں پہ ڈالتے ہوئے بولی۔
"دیکھیں آپ میرا دل توڑ رہی ہیں"۔
اور وہ ایک خشمگیں نظر اس پہ ڈال کر رہ گئی۔
"شاد بیٹے کیا حال ہے۔ پشاور کا چکر لگا آئے؟" اچانک ہی بھاری بھرکم گورنس نمودار ہوتے ہوئے شفقت سے اس کا حال پوچھنے لگیں۔
"جی شکریہ ٹھیک ہوں۔ یہ پائی میں نے خود پکائی ہے۔ آپ لوگوں کو چکھانے لے آیا"۔
"خوب۔ ضرور کھائیں گے بیٹا"۔ وہ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے یہ بڑا سا پیس توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولیں۔
"جی شکریہ"۔ وہ ایک نظر حیرت زدہ ہوتی مس فصیح احمد پہ ڈالتے ہوئے عاجزی سے بولا۔

"کیسے رہے اتنے دن؟ میں تو یاد ہی کرتی رہی۔"

"آپ نے یاد کیا تھا مجھے؟" وہ پھر جاپانی گڑیا کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور اُس نے یہ سب برداشت نہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی کتاب آنکھوں کے سامنے کر لی۔

کامران دل کھول کر ہنس دیا۔ گورنس نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ اب بھی اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

"یہ۔ یہ نہیں کھائیں گی؟" اُس نے معصومیت سے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بیٹی! میں تو تمھیں پوچھنا ہی بھول گئی۔ مزیدار ہی اتنی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ لو بیٹی! یہ تم کھاؤ"۔ وہ پلیٹ اُس کی طرف کھسکاتے ہوئے بولیں۔

"شکریہ ماما۔ میرا دل نہیں کر رہا۔ اس وقت"۔ کتاب اب بھی اُس کے چہرے کے آگے تھی۔

"چکھ کر تو دیکھو دل خود بخود ہی کرنے لگے گا۔ اتنی خستہ بنائی ہے۔ میں تو حیران ہوں۔ ایسی مزیدار چیز تو ہمارا خانساماں بھی نہ بنا سکے گا۔"

"شرماتی ہیں شاید"۔ وہ احمقوں کی طرح بولا۔ "لیجیے میں چلا جاتا ہوں۔ پھر ضرور کھالیں گی یہ"

اور مس فصیح نے جھٹ کتاب چہرے کے آگے سے ہٹا کر اُسے گھورا۔ مگر

اُس کی طرف پیٹھ کئے وہ اپنے برآمدے کی طرف چلا جا رہا تھا۔

"بدتمیز کہیں کا"۔

"کیوں بیٹی؟"۔ ماما اب بھی کھانے میں مصروف تھیں "اُس نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی"۔

"میں ۔ میں اس سے شرماؤں گی؟"۔ وہ غصہ ضبط نہ کر سکی۔

اور پھر اُس نے ماما کے بہت اصرار پر بھی وہ پائی نہ کھائی۔

"میں ہی کھالوں گی بیٹی! ورنہ دل ٹوٹ جائے گا بے چارے کا"۔ وہ اطمینان سے باقی ماندہ پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگیں۔

اور وہ کوفت زدہ سی کتاب کے صفحے اُلٹنے لگی۔

"میں پانی پی کر آتی ہوں۔ اتنی چٹپٹی تھی۔" ماما چٹخارے لیتے ہوئے پانی کے لئے اندر چل دیں۔

اور تبھی میدان صاف دیکھ وہ پھر چلا آیا۔

"پلیٹ دے دیجئے"۔

اُس کا دوبارہ آنا اُسے سخت ناگوار گزرا۔ مگر پھر بھی پلیٹ اُسے دینا ہی پڑی تو وہ پلیٹ لئے ریلنگ تک آ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر پلیٹ اُس کی طرف بڑھائی ساتھ ہی اس کے کھلے سنہرے بال اس کے بازو پر سے پھسلتے ہوئے پلیٹ پر جھک گئے۔ کامران نے ہاتھ بڑھایا۔ اطمینان سے اس کے بال اپنے ہاتھ میں اکٹھے

کئے اور آہستہ سے اس کے شانے پر اچھال دیئے۔ پھر غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پلیٹ لیتے لیتے اپنا ہاتھ اس کے بے حد نازک ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ اب بھی بڑے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اس نے دیکھا اس کی بے حد خوبصورت سنہری جھالروں جیسی پلکیں تیورا کر جھک گئی تھیں۔ اور چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا تھا۔

وہ بولی کچھ نہیں۔ شاید اپنا شدید غصہ برداشت کر رہی تھی۔ یا پھر اپنے رگ و پے میں دوڑتی سنسنی پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بہرحال اس کے ہاتھ پر سے اپنی گرفت ہٹاتے ہوئے اس نے پلیٹ پکڑی اور مسکراتے ہوئے واپس چلا آیا۔

نعیم کے سامنے پہنچ کر وہ کھل کر ہنس دیا۔ اور نعیم سچ مچ ناراض نظر آنے لگا۔

"کیوں خیریت" "۔ کامران اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یا تو تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو اور یا پھر خود بیوقوف بن رہے ہو۔"

"دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں ہے"۔ وہ خوبصورتی سے ہنستے ہوئے بولا

جبکہ ابھی تھوڑی دیر قبل اس کا ہاتھ چھوتے ہی اس نے ایک واضح سا بجلی کے کرنٹ سے ملتا جلتا Kشاک سا ہی محسوس کیا تھا۔

لیکن مثبت اور منفی یکجا ہوں گے۔ تو Kشاک تو پیدا ہوگا ہی۔ اس نے فوراً خیال جھٹکا۔

"ہے اور ضرور ہے"۔

"اوں ہونہہ"۔ وہ پورے وثوق سے بولا۔

"اچھا کھلا آئے پائی"۔

"نہیں"۔

"کیوں؟"

"ناراض ہے"۔

"تو منالو"۔

"میں ایسے کام نہیں کیا کرتا"۔

"تمہاری آنٹی" پھولوں کی وزن والی" نے کچھ کھایا؟"

"کچھ؟ اُس نے تو پوری پلیٹ صاف کر دی ہے"۔

"لاحول ولا۔ میں کیا نہیں کھا سکتا تھا جو تم نے ساری پلیٹ اُس کے آگے رکھ دی جا کر"۔ اُس کا دل واقعی ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔ پھر اتنی محنت الگ کی تھی۔

"اُس کے آگے تھوڑی رکھی تھی"۔

"پھر کس کے آگے رکھی تھی؟"۔ وہ مزید غصے میں بولا۔

"جا پانی گڑیا کے"۔

"کیا؟"۔

"ہاں"۔ وہ آرام سے بولا۔

"اب کچھ کہوں گا تو پھر مکرنے لگو گے۔"

"نہیں مکروں گا"۔

"جاپانی گڑیا پر دل آگیا نا؟"

"حضور کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس دل کا کسی پر آجانا ناممکن ہے۔ اور پھر اس جاپانی گڑیا پر؟" اس کے لہجے میں تمسخر پوشیدہ تھا۔

"اچھا میں خط لکھتا ہوں جا کر"۔ نعیم کرسی پر سے کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور اگر تم برا مانو تو میں تمہارے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھ لوں گا"۔

کامران بھی اسی کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چل دیا۔

۸

آج پھر بادل گھر آئے تھے۔ سیاہ بادل کسی مست خرام کی طرح ایک دوسرے کو روندتے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے پورے آکاش کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ قریب ہی سیب کے درخت ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے غیر متوازن ہو رہے تھے۔ سرخی مائل سیب اس وقت بھی جھولے جھول

رہے تھے۔

اپنے ہاتھ روم کے آگے برآمدے کے مرمریں ستون سے ٹیک لگائے دونوں بازو سینے پہ باندھے وہ ماحول کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس نے اُوپر نگاہ کی۔ سیاہ بادل اور سیب کے درخت آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ بادل درختوں کے پتوں اور سیبوں کے بیچوں بیچ دھوئیں کی طرح تحلیل ہو ہو کر گزر رہے تھے۔ کتنا انوکھا سماں تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا برآمدے کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ پھر اُس کی نظر دائیں طرف پڑی مس فصیح احمد بھی سکارلٹ ریڈ گرم سوٹ پہنے اُسی کا ہمرنگ دوپٹہ کندھوں پر ڈالے بال اب بھی کھلے چھوڑے کپڑوں کے ہمرنگ چوڑے سے بینڈ سے سنبھالے دیتے ریلنگ کے سہارے کھڑی گھنگھور گھٹاؤں میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

اُسے دیکھتے ہی کامران کے لبوں پہ دلنشیں مسکراہٹ بکھر گئی، آگے بڑھ کر وہ سیبوں والی ڈھلان پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر یونہی کھڑا ادِرگرد دیکھتا رہا۔ اُسے ماننا پڑ رہا تھا۔ کہ جب سے وہ آیا تھا۔ ہر روز اور ہر لمحہ موسم اور اطراف اس قدر حسین ہوتے تھے۔ کہ کبھی اُسے یکسانیت یا بوریت کا احساس نہ ہُوا تھا۔

آگے بڑھ کر اُس نے ایک بڑا سا سیب توڑ لیا۔ ہاتھوں میں مَل کر صاف کیا

اور بڑا سا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگا۔ باغ کے سیب اگرچہ پوری طرح ابھی پکے نہیں تھے۔ مگر پھر بھی بہت خوش ذائقہ تھے۔

اس نے پھر اُدھر دیکھا۔ مس فصیح احمد ندی کی طرف رُخ کئے ماحول کے سحر میں یوں کھوئی تھی۔ کہ گرد و پیش کا احساس تک نہ رہا تھا۔

تبھی اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔ ہونٹوں پر شوخ ہنسی مچلنے لگی۔ اُس نے ایک اور بڑا سا سیب توڑا۔ اچھی طرح نشانہ لیا۔ اور تاک کر مس فصیح احمد کی کمر میں دے مارا۔ اگرچہ اسے یہ احساس پورا تھا۔ کہ سیب بہت بڑا۔ اُس کی کمر بہت نازک اور وار کافی بھاری تھا۔

اس اچانک حملے پر وہ اپنی چیخ روک نہ سکی۔ وار بھی اچانک تھا۔ اور چوٹ بھی یقیناً آئی تھی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ جہاں سے وار کیا گیا تھا۔

"کھائیے نا"۔ اپنا سیب پھر دانتوں سے توڑتے ہوئے اس نے اس کی طرف پھینکتے ہوئے سیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈھٹائی سے کہا۔

"بدتمیز"۔ وہ تکلیف سے تڑپتے ہوئے غصّے سے چیخی۔

اور کامران کو پہلی بار احساس ہوا۔ اس کا نہیں کہ اُسے سیب مارنا اخلاق کے منافی تھا۔ بلکہ اس کا کہ صنفِ نازک کے لئے یہ وار کافی تکلیف دہ تھی خاص کر اس چھوٹی سی، نازک سی، کانچ ایسے بدن والی لڑکی کے لئے۔

وہ پہاڑی سے واپس اترتے ہوئے اس کی طرف چل پڑا۔

"جی کیا فرمایا آپ نے؟"۔ پاس جاکر اُس نے مسکین سی شکل بنا کر پوچھا۔
"آپ سخت بدتمیز ہیں۔ لوفر ہیں"۔ اُس کی شربتی آنکھیں چوٹ کی تکلیف سے جھلملائی ہوئی تھیں۔ مگر آواز میں قہرمانی تناؤ تھا۔
"بجا فرمایا آپ نے"۔ وہ گردن کھجاتے ہوئے اُس کی ڈبڈبائی آنکھوں میں تکتے ہوئے بولا۔
"آپ چلے جائیں یہاں سے"۔ وہ آپے سے باہر ہی تو ہو گئی۔ اور ساتھ ہی آنسو لڑھک کر اُس کے چکنے گلابی گالوں پہ آ رہے۔
"اور اگر میں نہ جاؤں تو؟"۔ اُس نے اس عجب انداز سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔
کہ وہ پلکیں گراتی اُٹھاتی رہ گئی۔ اور کامران کو آج پہلی بار اس پہ ترس آیا۔ اُس کی ڈھٹائی سے لاجواب ہو کر وہ مڑی۔ اور دو قدم آگے چل کر سیڑھیاں اُترتی ندی میں اُتر گئی۔
اُسے اپنے رویّے پر ندامت سی ہوئی۔ اپنا سیب اب بھی اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ آگے چل پڑا۔
پھر جانے کیسے؟ خود بخود ہی اُس کے قدم ندی میں اُترتی سیڑھیوں پر چل پڑے۔
"آپ۔ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"۔ اُسے وہاں دیکھ کر ایک پل کو

وہ واقعی ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

"کیا پتہ"۔ وہ عجیب لچارگی سے بولا۔

"آپ چاہتے کیا ہیں؟"۔ وہ سنبھلتے ہوئے پوچھنے لگی۔ مزید کمزوری کا مظاہرہ کرنا اُسے اچھا نہ لگا۔

"میں؟ کچھ نہیں۔ سیب کھائیں گی؟"۔ وہ اُسی سیب سے پھر دانتوں سے کاٹ کر باقی اُسے پیش کرتے ہوئے بولا۔

اور وہ چہرے پر آئے بال ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"آپ کے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں"۔ وہ اچانک بولا۔

اور اُسے وہاں سے بھی جانا پڑ گیا۔

"میں آپ کے فادر سے آپ کی شکایت کردوں گی"۔ اپنی طرف کی سیڑھیوں پر قدم بڑھاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پلیز! آئندہ ایسا نہیں ہوگا"۔

"جو ہو چکا ہے وہ کافی سے زیادہ ہے"۔ وہ رخ موڑے بغیر آگے بڑھتی گئی

"آپ میری شکایت نہیں کریں گی"۔ اُس نے نیچے سے آواز دی

"ضرور اور ضرور کردوں گی"۔ آخری سیڑھی پر پہنچتے ہوئے اُس نے کہا۔ اور آگے چل پڑی۔

اُس نے باقی بچا سیب پانی میں پھینک دیا۔ چند لمحے دُور تک اُسے پانی میں لڑھکتے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر واپس مُڑا۔
اپنی سیڑھیاں چڑھا۔ ایک نظر ٹیرس پر دیکھا مس نفیس احمد اندر جا چکی تھی۔
دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نادانستگی میں آپس میں اُلجھاتا وہ سوچوں میں گُم دھیرے دھیرے قدم اُٹھا رہا تھا۔ کبھی خوبصورت چہرے پہ سنجیدگی چھا جاتی اور ——
کبھی خود بخود ہی دلکش ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھر آتی۔
"بدتمیز"۔ اپنے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی اسی کے بستر میں گھسے نعیم نے زوردار خیر مقدم کیا۔
"اوہ۔ تو تم چوکیداری میں مصروف تھے؟"۔ وہ کوٹ اُتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "کب آئے؟"۔
"عین "بدتمیز" کے وقت۔ تم سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی یہ نہ دیکھ سکے"۔
"ابھی بتاتا ہوں آکر"۔ وہ ہنستے ہوئے کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ اور پھر فارغ ہوتے ہی دو منٹ میں وہ نعیم کے سامنے بیٹھا تھا۔
"ہاں تو سناؤ"۔ گرم کوفی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نعیم بولا۔
اور کامران نے ایک گہری سانس لی۔ "سیب مارا تھا کمر میں تاک کر"۔

"خدا کے لئے کامران مذاق اس طرح کیا جاتا ہے۔" وہ اپنا کیپ وہیں چھوڑ تا ناراض نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"میں مذاق تھوڑی کر رہا ہوں۔ میں تو اُس سے اپنا بدلہ لے رہا ہوں"۔ وہ جاندار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"پھر؟۔ اُس نے اچھی الفاظ سے نوازا ہوگا"۔

"ہاں"۔

" ویسے ڈھیٹ خاصے ہو گئے ہو"۔

" واقعی۔ عام حالات میں میں ان الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا"۔

"ہوں . . . . ." نعیم اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

" اور پھر رونے لگی تھی"۔ وہ مزید ہنستے ہوئے بتانے لگا۔ "کہیں ایسی ویسی جگہ لگ جاتا اور لمبی پڑ جاتی تو؟"۔

" چھوڑو یار! بلی کی سائنس پائی ہے۔ ایسی آسانی سے مرنے والی نہیں"۔ ساتھ ہی اُسے جانے کیوں؟

اُس کا بے حد نازک بدن اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی شربتی آنکھیں یاد آئیں۔

" اچھا پھر؟"

"وہ پانی میں اُتر گئی"۔

"ہوں"۔

"میں بھی اُتر گیا"۔

"تمھیں جانے کب شرم آئے گی۔ اتنی تنگ سی ندی میں اُس کے ساتھ اُترتے ہوئے تمھیں شرم نہ آئی"۔

"بالکل نہیں۔ ویسے وہ واقعی گھبرا گئی تھی مجھے وہاں دیکھ کر۔ جگہ بھی بالکل تنگ سی ہے نا۔ ایک طرف پہاڑی ہے۔ باقی دو طرف کوٹھیاں ہیں اُونچی اُونچی۔۔۔۔"

"بس اب تفصیل رہنے دو۔ جگہ میں نے دیکھی ہے۔ آگے بتاؤ"۔

"میں نے اُس کے ہاتھوں کی تعریف کر دی"۔

"دِل سے؟"

"نہیں"۔

"تو کیا اُس کے ہاتھ قابلِ تعریف نہیں ہیں؟" نعیم نے اچانک پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا"۔ اُس نے خالص جھوٹ بولا۔ اُس کے ہاتھوں سے متاثر ہو کر ہی اُس نے اُن کی تعریف کی تھی۔

"کیوں؟"

" اس لئے کہ میں نے انھیں اُس نظر سے نہیں دیکھا تھا "۔ اُس نے اب بھی غلط بیانی سے کام لیا۔

" اچھا پھر؟ خوش ہوئی سن کر؟ "۔

" ارے کہاں ؟ ۔ وہ تو دھمکی دیتی ہوئی اپنی سیڑھیاں چڑھ گئی "۔

" مثلاً ؟ "۔

" کہ وہ میری شکایت کر دے گی "۔ اُس نے مسکراتے ہوئے خالی کپ میز پر رکھا ۔

" کس سے ؟ "۔ نعیم بھی کھل کر ہنس دیا ۔

" میرے فادر سے "۔

اور نعیم قہقہے لگا لگا کر ہنسنے لگا ۔

" یعنی تمھارے باپ سے "

" ہاں "۔

" جو یہاں کا ڈی یس پی ہے "۔

" یقیناً "۔

اور پھر دیر تک اُن کے جاندار قہقہے در و دیوار سے ٹکراتے رہے ۔

۹

رات ہی وہ دو دن کے دورے کے بعد گھر پہنچا تھا۔ آج آفس سے وقت پر ہی چھٹی ہو گئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی باوجود نعیم کے چھیڑ چھاڑ کے وہ اُسے کمرے سے نکال باہر کر کے لیٹ رہا۔

رات اُس نے مقامی ٹھیکیدار کے یہاں ڈنر پر بھی جانا تھا۔ واپسی یقیناً دیر سے ہونی تھی۔ وہ کل کا خاصا تھکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر سو کر آرام کر لینا ضروری سمجھا۔

اور پھر ڈھائی بجے کا سویا وہ پانچ بجے ہی اُٹھا۔ طبیعت خاصی ہلکی معلوم ہو رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اُس نے کمرے میں ہی نعیم کے ساتھ چائے پی۔ پھر اُٹھ کر

الماری سے وہ تصویریں نکالیں، جو آج ہی دُھل کر آئی تھیں، اور جن میں وہ تصویریں بھی تھیں، جو اُس کے یہاں چارج لینے کے دِنوں میں کھینچی گئی تھیں۔ نعیم نے دیکھ کر خاصی تنقید آرائی کے بعد اُسے واپس دیں۔ پھر تصویریں واپس رکھتے رکھتے کامران کی نظر اپنی پستول پر گئی۔ اُٹھا کر کچھ دیر ہاتھ میں لیے اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ پھر

اچانک ہی اُس کی آنکھیں شرارت سے چمک اُٹھیں۔ ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"آؤ اپنا نشانہ آزمائیں"۔ وہ اچانک بولا۔

"چلو"۔ نعیم ٹانگوں پر سے کمبل پرے ہٹاتے ہوئے بولا۔ اُسے بھی کھیل دلچسپ معلوم ہُوا۔

دونوں کوریڈور میں نکل آئے۔ کامران نے قدم اندرونی مرمریں برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھاتے:

"اِس طرف نہیں مِس فصیح احمد اور اُس کی گورنس ٹیرس پر بیٹھی ہوں گی" نعیم مخالف رُخ کی طرف ہو لیا۔

"نہیں اسی طرف ہو گا"۔ کامران کا تو مقصد ہی یہی تھا۔ فیصلہ کُن آواز میں بولا۔

"بھئی ایٹی کیٹ بھی کوئی چیز ہے"۔ نعیم کسی طرح تیار نہیں تھا۔

"اس نام کی ہر چیز میں شروع دن سے اُس ندی میں پھینک آیا ہوں"۔ وہ ندی کے رُخ اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں کامران! تنگ کرنے کی بھی آخر حد ہوتی ہے۔ لیڈیز آخر لیڈیز ہوتی ہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا"۔

"تمہیں کرنا پڑے گا"۔ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ بولا۔

"پلیز کامران ۔"

"پلیز! ۔ اور ساتھ ہی وہ نعیم کو کھینچتا ہوا دروازے سے باہر لے گیا ۔

تھوڑی دیر برآمدے میں کھڑا نظروں ہی نظروں میں جگہ پسند کرتا رہا ۔ پھر خوبصورت آنکھیں چمکنے لگیں ۔

" وہاں ٹھیک رہے گا " ٹیرس سے قریب ترین ندی کے اوپر والی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ۔

" ہرگز نہیں " نعیم پھر بدکا ۔ " اُن لوگوں کے اتنے قریب ؟ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے " ۔ وہ دیکھ رہا تھا ۔ کامران عین اُس جگہ کا نشانہ لینے جا رہا تھا ۔ جہاں سے صرف دو تین فٹ کی اونچائی پر مس فصیح احمد اور اس کی گورنس اطمینان سے بیٹھیں باتوں میں مصروف تھیں ۔

" تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو ۔ الزام تو ویسے بھی مجھے ہی دیا جائے گا ۔ لوفر تو میں ہی ہوں " ۔ وہ ہنستے ہوئے بولا ۔

" پھر تم ہی کرو ۔ میں تماشہ دیکھوں گا " وہ مرمریں ستون کی اوٹ میں ہوتے ہوئے بولا ۔

" ٹھیک ہے " ۔ وہ مصالحت پر اُتر آیا ۔

کامران نے نشانہ لیا - اچھی طرح - اور پھر اچانک ہی زور سے —
اُن لوگوں کے بالکل قریب سے — ٹھاہ کی آواز آئی -
مس فصیح احمد اُچھل کر چیختے ہوئے جس طرح گورنس سے جا لپٹی تھی -
اُسے دیکھ کر تو نعیم بھی اپنے اوپر قابو نہ پاسکا - اس کا قہقہہ چھوٹ ہی گیا -
گورنس بھی کچھ کم خوفزدہ نہ ہوئی تھیں - قدرے توقف کے بعد اُن کے
کے ہوش بجا ہوئے - اور مس فصیح احمد نے نظروں ہی نظروں میں اپنے یقینی
چور کو تلاش کر کے گھورا - تو کامران نے پورے دانت نکالتے ہوئے اُس
کی طرف ہاتھ ہلا دیا - جیسے اپنے بالکل صحیح نشانے کی داد وصول کر رہا ہو -
"Idiot" وہ مزید برداشت نہ کرسکی - اُسے سو فیصد یقین
تھا - یہ اُس نے محض اُس کو تنگ کرنے کو کیا تھا -
"فرمائیے کیا حال چال ہیں ؟" - اَن سُنی کرتے ہوئے
قریب جا کر اُس نے خوش اخلاقی سے اُن کا حال دریافت کیا -
"بیٹے تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا"
"ارے نہیں آنٹی" - ٹھاہ - ٹھاہ - اُس نے مخالف سمت پر مزید
دو فائر کر دیئے " - اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ؟" رُخ واپس موڑ کر
مس فصیح احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بے حد لاپرواہی سے بولا -
"او ئی اللہ" - اب کے مس فصیح سے زیادہ گورنس گھبرا گئیں -

اور رہا ۔ نے ندی کے بہتے پانیوں میں ایک اور فائر کر دیا ۔
"کیوں؟ آپ بھی ڈرتی ہیں کیا؟" وہ مس فصیح احمد کی بے حد خوبصورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے نیازی سے پوچھنے لگا ۔۔۔ اور مس فصیح کا دل چاہا۔ اُس کے سارے بال نوچ ڈالے ۔
"آنٹی پلیز! حوصلہ کیجئے"۔ وہ دوپٹے سے آنکھ کان ڈھانپے گورنس سے مخاطب ہوا "کم از کم آپ جیسی خاتون کا دل تو بہت بڑا ہونا چاہیئے"۔ اُن کا وزن کافی سے زیادہ تھا پھر دل بھی بڑا ہونا چاہیئے تھا نا اسی انداز سے ۔

کوئی اور وقت ہوتا۔ تو مس فصیح احمد گورنس کی حالت اور کامران کی بات پر ہنسے بنا نہ رہتی۔ مگر اس وقت ۔۔۔ اس وقت تو وہ مارے اشتعال کے پاگل سی ہو رہی تھی۔ گورنس کو وہیں چھوڑ چھاڑ کھٹ پٹ کرتی اپنے کمرے میں جا گھسی ۔
"بیٹے تم لوگوں کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں"! وہ کامران کی بات پہ آنکھیں کھولتے ہوئے کہنے لگیں "اپنا تو بس۔ توبہ توبہ بیٹے! میرا تو اب بھی دل کانپ رہا ہے ۔ ۔ اور ۔۔۔ یہ شائی کہاں چلی گئی؟"۔
تو محترمہ شائی کہلاتی ہے۔ مس فصیح احمد جیسے ثقیل تنہا طیب کے برعکس "شائی"۔ چھوٹی موٹی سا نام!

ننھا سا۔ نازک سا۔ کانپ اٹھے بدن سے ملتا جلتا سا۔

"شائی ؟"۔

" ہاں بیٹے شائستہ نام ہے۔ پر ہمارے صاحب لاڈ سے" شائی" کہہ کر پکارتے ہیں"۔ گورتس نے وضاحت کردی۔

" بہت مناسب نام رکھا ہے انہوں نے۔ آپ انہیں گلوکوز اور چکن سوپ پلائیے گا۔ خون کافی خشک ہوا ہوگا۔ تعویز بھی کرائیے گا کسی اچھے بزرگ سے"۔

" بیٹے تم تو ہمارا مذاق ہی اُڑانے لگے "

" نہیں آنٹی! بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اور آپکا مذاق اُڑاؤں ؟ ہاں مس فصیح! ان کا رنگ ضرور اُڑ گیا تھا۔ سوپ پلانا نہ بھولیے گا"۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

آنٹی بھی سا تھ دینے لگیں۔ یہی تو عمر ہوتی ہے ہنسنے کھیلنے کی۔ وہ سوچنے لگیں۔

" اچھا انٹی اب اجازت "۔

" اللہ کامیاب کرے۔ عمر دراز ہو "

" شکریہ "۔ کامران نے کہا۔ اور

وہاں سے چلا آیا۔ نعیم برآمدے میں نہیں تھا۔ اندر جا چکا تھا شاید۔

" آج شکایت یقینی ہے"۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی نعیم کی شکل دیکھ کر وہ بولا۔

اور نعیم کی ہنسی جو قدرے کم ہونے والی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی فلک شگاف

قہقہوں میں بدل گئی۔

اُس نے پستول کی باقی گولیاں نکالیں اور دونوں چیزیں سنبھال کر

الماری میں رکھ دیں۔

وہیں ایک طرف بھنی مونگ پھلیوں کا پیکٹ پڑا تھا۔ اُٹھا لیا۔ کھول کر چند

دانے مُنہ میں ڈالے۔

"دکھاؤ" کچھ ہاتھ میں نکال کر نعیم کو پیش کیے۔

"ماشاءاللہ ۱۰۰ روپے"۔ وہ زور سے بولا۔" بس اتنے ہی دانے ہیں سارے

رکھنا یہاں"۔

اور کامران کے بڑی دیر کے رکے قہقہے چھوٹ ہی گئے۔

"اس موٹی کو میں نے کہہ دیا ہے۔ خوب سوپ وغیرہ پلائے پتلی کو۔ خون

کافی خشک ہوا ہوگا"۔

"تم نے بھی حد کر دی کامران"۔

"ابھی میدان صاف ہے۔ نہ اپنے سر پر کوئی بزرگ موجود ہے۔ نہ مسٹر فصیح احمد

تشریف لا رہے ہیں۔ جو جی میں آئیگا کریں گے"۔

"ابھی اور بھی ارادے ہیں۔؟"۔

"ابھی ہوا ہی کیا ہے ؟"۔

"اور اگر اُس نے اپنے باپ کو شکایت کر دی تو؟"

"یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

"وہ کیوں کر؟"۔

"لڑکیاں اپنے باپوں کو یہ باتیں نہیں بتایا کرتیں"۔

"اور اگر بتا دیں تو؟"

"پھر وہ لڑکی نہیں لڑکا ہوگی"۔ کامران نے اطمینان سے کہا۔

"خدا تجھے سمجھے"۔

"تجھے بھی"۔

"مجھے کیوں؟"

"میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے ہو؟"

"ہاہاہا"۔ نعیم پورے کا پورا پیکٹ منہ میں خالی کرتے ہوئے بولا۔

"ہا ہا ہا"۔ کامران اس کے منہ پر جھپٹتے ہوئے چیخا۔

۱۰

"صاحب، آپکا فون ہے"۔ آفس پہنچتے ہی اسے اپنے سٹینو نے بتایا۔

"ہیلو۔ ڈی سی صاحب ہیں؟" ایک بے حد نازک نسوانی آواز اس کی

سماعت سے ٹکرائی۔

یہ مس فصیح احمد ہیں چھٹی حس نے اُسے بتایا۔

"جی بول رہا ہوں"۔ وہ اچانک ہی بھاری سی آواز میں بولا۔

"انکل! ہیں۔ ..... میں..... شائی فصیح احمد بول رہی ہوں"۔ یکدم ہی اس کا لب و لہجہ اس طرح بدل گیا۔ جیسے وہ واقعی اپنے کسی بزرگ سے مخاطب ہو اور ہوتا بھی یہی۔ اگر واقعی ڈی یسی اتنی ہی عمر کا ہوتا کہ کامران جتنی عمر کا لڑکا اُس کا بیٹا ہوتا تو۔ فصیح احمد گھر پر ہوتے۔ دونوں کا آپس میں پڑوس اور اچھے تعلقات ہوتے تو وہ انکل ہی کہلاتا اس وقت۔

"اوہ۔ اچھا۔ اچھا۔" وہ بھی انکل ہی بن گیا۔ موٹی سی آواز میں سر ہلا ہلا کر بولا۔

"انکل! وہ دراصل۔۔۔"

"ہاں ہاں بتایئے بتایئے"۔ وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"وہ۔۔۔ انکل۔۔۔۔" وہ پھر جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"بیٹے کیا بات ہے؟ بے تکلف بتا دیں"۔ اُس نے حوصلہ دیا۔

"وہ انکل۔۔۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"اوہ ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔۔" وہ سمجھ گیا وہ کیا کہنے والی تھی؟

"وہ۔۔۔ وہ۔ آپکا بیٹا تنگ کرتا ہے انکل۔۔ آئی ایم سوری آپکو

سُن کر تکلیف ہو گی۔ لیکن ۔۔۔ وہ بہت دنوں سے تنگ کر رہا ہے۔ میں ہر بار چپ کر گئی۔ مگر اب سوچا آپ کو بتا دوں۔ آپ ضرور میری مدد کریں گے۔ خاص کر ایسے وقت میں جبکہ بابا جان بھی گھر پر نہیں ہیں"۔

"خبیث کہیں کا۔ نالائق۔ آج میں اس کی وہ خبر لوں گا۔ کہ یاد رکھے گا نااہل۔ پڑوس میں ایسی حرکتیں کرتے شرم نہ آئی اُسے۔ بس بیٹے! آپ فکر نہ کریں۔ چمڑی ادھیڑ کے رکھ دوں گا۔ مجھے افسوس ہے بیٹے۔۔ مجھے"۔

" ایم ریلی ویری سوری انکل ۔۔۔ میں آپ کو نہ ہی بتاتی تو اچھا تھا"۔

اتنا اچھا

باپ! اور اتنا بُرا بیٹا؟؟۔

آپ نے بہت اچھا کیا بتا دیا۔ بھلا کیسے نہ بتاتیں۔ کوئی بھی بات ہو بے تکلف بتا دیا کریں۔ فصیح احمد صاحب یہاں نہیں ہیں تو یہ نہ سمجھیں آپ اکیلی ہیں۔ کسی قسم کی فکر نہ کریں"۔

" سو نائس آف یو انکل۔ تھینک یو انکل۔"

" اور کوئی خدمت بیٹے؟"

" شکریہ انکل۔ میرے ذہن پر بڑا بوجھ تھا۔ آپ سے باتیں ہوئیں ہلکا ہو گیا۔ کل۔ بابا جان سے فون پر بھی آپ کی باتیں ہوئیں۔۔۔"

" بھلا کیا بیٹے؟"

"بس یوں ہی انکل۔ بابا جان پوچھتے تھے ہم نے آپ کی دعوت کی یا نہیں؟ دراصل وہ جب یہاں ہوتے ہیں تو خود ہی ڈی سی ز کو اپنے یہاں انوائیٹ کرتے ہیں۔

"اچھا اچھا ۔۔۔"

"پھر پوچھتے تھے کیسے ہیں؟ میں نے کہا اچھے ہیں ۔۔۔"

"آپ کو بھلا کیسے معلوم ہوا بیٹے کہ ہم اچھے ہیں"۔

"اوہ انکل! آپ ضرور اچھے ہیں۔ لوگوں سے جیسا سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر ـــــ اچھے ہیں آپ ۔۔۔" دنوں بعد اسے کسی مشفق ہستی سے باتیں کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ بابا جان کی غیر موجودگی کا ردِعمل تھا شاید کہ وہ کسی بزرگ کی مشفقانہ گفتگو سن کر نہال ہوتی جا رہی تھی۔

"اوہ! شکریہ بیٹے ۔۔۔"

"اچھا انکل! خدا حافظ"۔

"خدا حافظ"۔ اس نے فون بند کیا۔

ادھر ادھر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ قدرے کنکھار کر وہ سنبھلا۔ اور اپنے سامنے کھلے فائیل پر جھک آیا۔

"آداب انکل" نعیم بالکل پیچھے سے اس کے کان میں بولا۔

اور کامران جیسے اچھل کر رہ گیا۔

"تو تم ہو؟" ۔ اُس نے گہری سانس لی ۔

"جی انکل" ۔

"اور سب کچھ سُن بھی لیا"

"جی بالکل انکل" ۔

"اُس طرف کی گفتگو بھی؟"

"ضرور انکل" ۔

"تو پھر بیٹھو انکل" ۔ اُس نے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا ۔

مگر نعیم بیٹھنے کے بجائے ہونقوں کی طرح مُنہ اُٹھا کر اپنا قہقہہ لگا بیٹھا ۔ کہ کامران سے بھی مزید ضبط نہ ہوسکا ۔

اور پھر وہ قہقہے گونجے وہ قہقہے ۔۔۔ کہ پاس والے کمرے میں سٹینو ۔ چپڑاسی تک چونک اُٹھے ۔

"ویسے محو تھے بالکل" ۔

کامران خاموشی سے ہنس دیا ۔

"میری موجودگی کا احساس تک نہ ہُوا ۔ جبکہ بالکل کان لگا کر میں سب سُن رہا تھا" ۔

وہ پھر ہنس دیا

"اور تجھے شرم نہ آئی ۔

"کیوں؟"۔

"اُسے بیٹی بیٹی کہہ رہے تھے۔"

"اگر غور کیا ہو تم نے تو میں نے بیٹی نہیں بیٹے کہا تھا۔"

"یعنی نکاح ٹوٹنے کا امکان نہیں"۔

"بالکل نہیں"۔

"تو یہ بات ہے؟" نعیم شرارت سے بولا۔

"پھر شروع ہو گئے؟"۔

"شروع کیا۔ ہوگا بالکل ایسا ہی"۔

"یعنی؟"

"آجکل تم یقیناً اُسے پسند کرنے لگے ہو"۔

"ایسا دن نہیں آئیگا۔ تم فکر نہ کرو۔ اور سدھارو یونیورسٹی"۔

"ہاں وہی تو بتانے آیا تھا۔ آج میں دیر سے آؤں گا۔"

"کیوں جناب؟"

"ضروری نوٹس لکھنے ہیں"۔

"او۔ کے"۔

"خدا حافظ انکل"۔ وہ چلتے چلتے گویا ہوا۔

"خدا حافظ"۔ اُس نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

آفس سے چھٹی ہوتے ہی وہ گھر گیا۔ کھانا کھایا۔ خوب سویا۔ اُٹھ کر گرم پانی سے نہایا۔ تیار ہو کر ایک کپ گرم گرم کوفی پی۔ اور اندرونی برآمدے میں نکل آیا۔ سامنے نظریں پڑیں۔ مس فصیح احمد نہیں تھی۔ جبکہ ہر شام وہ ضرور ٹیرس پر موجود ہوا کرتی تھی۔

برآمدے سے ہوتا وہ سبب کے باغ میں جا نکلا۔ موسم آج بھی خوبصورت تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ حسین۔ سیاہ گھٹائیں آج بھی امڈ آئی تھیں۔ یخ لیتہ ہوا درختوں میں سر سرا رہی تھی۔ وقت سے پہلے ہی جیسے ہر چیز دھند میں لپٹی نظر آ رہی تھی۔

پہاڑی پر کی چوٹی سے ہوتا آج وہ پار اترنے لگا۔ تبھی اس کی نظر دائیں طرف پڑی۔ یہ مس فصیح احمد کی کوٹھی کا سامنے کا حصہ تھا۔ جو اُس نے آج سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ بڑا وسیع خوبصورت لان تھا۔ دیدہ زیب پھولوں کے تختے تھے۔ اور بے انتہا خوبصورت محل نما کوٹھی دور تک پھیلی نظر آ رہی تھی۔

اچانک اُس نے دیکھا مس فصیح احمد نیوی بلیو رنگ کا بے حد سمارٹ ڈریس پہنے، بالوں کو سادگی سے پن اپ کئے اکیلی اور پیدل ہی اپنے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ چند لمحے یوں ہی کھڑا وہ اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے یکدم ہی کچھ خیال آیا۔

آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ اور خوبصورت لبوں پر شریر مسکان اُبھر آئی۔

وہ تیزی سے چوٹی پر سے ہوتا واپس نیچے اترا۔ کمرے میں گیا۔ شوز بدلے۔ اور جن کپڑوں میں تھا انہی میں باہر کی طرف لپکا۔

نعیم کا سکوٹر مرمت سے واپس آیا تیار کھڑا تھا۔ پیڈل مارا۔ اور گیٹ سے نکلتے ہوئے جیسے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر لمحوں میں ہی اس نے مس فصیح احمد کو جا لیا۔

متوازن چال چلتی وہ بھی اپنے گھر کے قریب ہی سڑک پر بائیں طرف چلی جا رہی تھی۔ سکوٹر تیزی سے دوڑتا وہ اس سے آگے نکل گیا۔ اور پھر اچانک ہی واپس لوٹ کر اس کے بالکل قریب آتے ہوئے کچھ ایسا پلٹا کھایا۔ کہ سکوٹر سمیت علی اس کے قدموں میں آگرا۔ وہ۔

گرتے گرتے بچی۔ بمشکل اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے سرعت سے ایک طرف ہٹ گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ یہ [illegible] تھا کون ہے؟ قدرے حواس درست ہوئے اور اس کی شکل دیکھی۔ تو معاملے کی نوعیت سمجھ گئی۔

یہ اچانک حادثہ نہ تھا۔ سوچی سمجھی سکیم تھی۔

"اف میرا پاؤں" وہ اچانک پڑے پڑے اپنا پاؤں پکڑتے ہوئے کراہا۔

اس کی کراہ میں کرب انتہا تکلیف تھی۔ اس کی سوچ غلط بھی تو

ہو سکتی تھی۔ وہ سچ مچ بھی تو گر سکتا تھا۔ ایک پل کو وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

"اوہ۔ پروردگار۔۔۔۔" وہ پھر درد سے تڑپا۔

جانے کیا بات تھی؟ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ مگر قدم رُکے جا رہے تھے۔ کچھ بھی تھا۔ کیسا بھی تھا؟ پھر ان کا پڑوسی تھا۔ اور پھر آج ڈیڈی ہی سے بات ہوئی تھی۔ بہت شفیق ہستی تھی اُن کی۔ یہ اُن ہی کا تو بیٹا تھا۔ اس وقت اس کی مدد کرنا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ وہ۔

کچھ جھجکتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی۔

"ہائے"۔ وہ پھر چیخا۔

"پاؤں میں چوٹ آئی ہے؟" پچھلی رنجشیں بھول کر وہ بیٹھتے ہوئے اس کے پاؤں پہ جھک آئی۔

"ہاں"۔ اس کی آنکھوں تک میں تکلیف اُبھر آئی تھی۔

"اوہ۔ میں ابھی بلاتی ہوں کسی کو"۔ وہ ہمدردی سے بولی۔ "آپ کو ہوسپٹل لے جانا چاہیے۔"

"ہائے"۔۔۔

"پلیز۔ حوصلہ کیجیے۔ بس ابھی ہمارا ڈرائیور آپ کو ہوسپٹل پہنچاتا ہے" پھر اُسے اچانک خیال آیا۔ "آپ کے فادر بھی تو گھر پہ ہوں گے۔ انہیں بھی اطلاع کرتی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے نہیں نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے بولا "انھیں بالکل نہ کہیئے گا۔ چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ آج مجھے ڈانٹا بھی بہت ہے۔ آپ نے میری شکایت کی ہے نا۔" اس کا لہجہ بالکل معصوم بچے کا سا تھا۔ اور شانی کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔ "اچھا انہیں نہیں کہتی"۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر وہ چونکی۔ اس نے گرفت اچانک مضبوط کر لی تھی۔ اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہائے"۔ اپنے پاؤں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی قریب ہی اپنے گیٹ کی طرف بڑھی۔ اور کامران ادھر اُدھر دیکھتا۔ اپنے کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سکوٹر اٹھایا اس پر بیٹھا۔

"ٹاٹا"۔ وہ ابھی اپنے گیٹ کے پاس ہی تھی۔ کہ زن سے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اُسے "ٹاٹا" کیا۔ اور اس کا ردِ عمل دیکھے بغیر سیدھا اپنی کوٹھی کی طرف مُڑ گیا۔

آج پھر وہ اس کا منہ چڑا کر چلا گیا تھا۔ شانی کا خون کھول کھول اُٹھا۔ اُسے سمجھ نہ آئی۔ وہ کیا کرے؟۔ اس کی شکایت بھی کر دی تھی۔ ڈانٹ بھی پڑ گئی تھی۔ مگر ڈھیٹ اتنا تھا۔ ڈانٹ کا ذرا بھی تو اثر نہ ہوا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا۔ کیسے ہمدردی کے تحت وہ اُس کے قریب چلی گئی تھی۔ پھر کیسے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "لوفر کہیں کا۔ غنڈہ۔ بدمعاش۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ وہ بھول ہی گئی۔ کہ اس نے قریبی مکان میں اپنی دوست صوفیہ کے گھر جانا تھا۔

تبھی شاید وہ ماما کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ماما کچھ پریشان سی نظر آنے لگیں"۔ اوہ ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں... صوفیہ کو فون کیا ہے وہ خود آرہی ہے۔"

"اچھا اچھا میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" وہ قریبی کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"بیٹے! کاروار نے خط میں کیا لکھا ہے؟"

کل اُن کے آبائی گاؤں سے کاروار کا خط آیا تھا۔ اُسی کے متعلق ماما پوچھ رہی تھیں۔

"بہت کچھ لکھا ہے ماما۔ لمبی لمبی باتیں ہیں۔" وہ تدرے مسکرائی"۔ بعد میں بتاؤنگی۔ اِس وقت سر کچھ بھاری ہو رہا ہے"۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے آہستہ آہستہ بولی۔

اس وقت وہ باتوں کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ تو سوچنا چاہتی تھی۔ کوئی حل کوئی ترکیب۔ اس لوفر سے نجات حاصل کرنے کی۔ اس غنڈے سے پناہ پانے کی

"وہی تو میں دیکھ رہی ہوں دشمنوں کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تم آرام کرو۔ میں نیچے جاتی ہوں۔ تمہارے لئے رات کھانے میں مچھلی فرائی کرنے کو کہا تھا۔ مصالحے میں خود لگاؤں گی جاکر"۔ وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہتی گئیں۔

اور شائی اُسی طرح لیٹی ادھیڑبن میں مصروف رہی۔

۱۱

شام کے پانچ بج چکے تھے، بھیگا بھیگا سا موسم بے انتہا حسین ہو رہا تھا۔ سفید لگلے سے بادل پورے آسمان کو گھیرے میں لیئے ہوئے تھے۔ سدا بہار پائنز پہاڑیوں کو ڈھانپے بادلوں میں تحلیل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ مست خرام ہوا درختوں کے پتوں میں سرسرا رہی تھی۔ سامنے پانی آبشار کی صورت میں چاندی کی طرح چمکتا مخصوص شور سے نیچے ندی میں ایک تسلسل سے گر رہا تھا۔

کل اسکی چھٹی تھی۔ کالج میں کام اگرچہ آجکل زیادہ ہوتا تھا۔ امتحان بالکل قریب تھے۔ مگر چھٹی کے باعث ذہن پر کا بوجھ ضرور کچھ ہلکا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس آرم چیئر پر نیم دراز تھی، وہ چاہتی تھی، کہ ٹیرس پہ جاکر موسم سے لطف اندوز ہو۔ ٹیرس بنایا ہی اسی لئے گیا تھا۔ اس کی خواہش پر۔ اسی کے لئے ہی۔ ماما بھی دو بار آکر اُسے باہر جاکر بیٹھنے کی تاکید کر چکی تھیں۔ خود وہ آج پھر اُسکی پسندیدہ مخصوص ڈش بنانے میں مصروف تھیں۔ اور پھر ایسے موسم میں کمرے میں مقیّد رہنا قدرت کی لازوال خوبصورتیوں کی توہین بھی تھی۔ مگر

کل کے حادثے کے بعد جانے کیوں؟ اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ ٹیرس پہ جاکر بیٹھے۔ اور پھر اس کا سامنا ہو۔ اس نے جب بھی اُسے دیکھا تھا۔ ضرور کچھ کر گزرا تھا۔ پھر

آج کیسا اچھا موڈ تھا۔ ڈاک کرنے کا۔ غارت کر دیا کمبخت نے آکر۔ وہ غصے میں کھولتی سوچتی گئی۔ کوئی حل بھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ باپ سے شکایت کر کے بھی دیکھ لیا تھا۔ بابا جان گھر پر ہوتے تو یقیناً وہ یہ سب نہ کر پاتا۔ مگر بابا جان۔ اُن کے آنے میں تو ابھی پورے دو ماہ تھے۔ عمر کے تقاضے سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے وہ پہلے بھی دو چار ہوئی تھی۔ مگر اُس کے تیور ہی دیکھ کر دوبارہ کسی نے جرأت نہیں کی تھی، اور۔ یہ آدمی تو۔ جیسے ہینچے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ نہ ڈانٹ کا اثر ہوتا تھا۔ نہ دھمکی کارگر ہو رہی تھی۔

وہ پریشان سی بستر پہ پڑ رہی۔ آج وہ ٹیرس پر بھی نہیں گئی۔ ٹیرس پر بیٹھ کر موسم اور ارد گرد کے مناظر سے لطف اٹھانا اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ محبوب ترین مشغلہ تھا۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" ماما اندر آئیں اُسے واپس آتے دیکھ کر دریافت کرنا ضروری سمجھا "تم گئی نہیں صوفیہ بی بی کے گھر؟"۔

"بس یوں ہی ماما۔۔۔۔" جانے کیوں؟ وہ ماما کو نہ بتا سکی۔ پہلے دن اُنہیں یہ ضرور کہا تھا۔ کہ وہ اُسے اچھا نہیں لگتا۔ اور ماما کو اُسے منہ نہیں لگانا چاہیے۔ مگر اُس کے بعد معلوم نہیں کیا بات تھی۔؟ وہ مزید ماما کو کچھ نہ بتا سکی۔ کیسے کہتی کہ وہ کن نظروں سے اُسے تکا کرتا ہے۔ کیسی کیسی معنی خیز نظریں ہوتی ہیں اُس کی؟۔ اور یہ کیسے کہہ دیتی کہ آج اُس نے اُس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔ شاید۔

یہ اپنی باتیں ہوتی ہیں۔ پرائیویٹ سی۔ جو کسی کو بتائی نہیں جا سکتیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس میں اس کی مرضی شامل تھی۔ بلکہ۔ یہ تو کچھ کمی سی تھی اس کی۔ اور

آج ۔ کیا گاڑی تھی ؟ کہ وہ کچھ نہیں کرے گا ۔ جانے کیوں ؟

وہ اُس سے کچھ خائف سی رہنے لگی تھی ۔ شروع شروع میں تو نہیں ۔ البتہ ۔ بعد میں ۔ کچھ دن قبل سے ۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتی ۔ گھبرا سی جاتی ۔ اگرچہ گھبرانے کی کوئی ایسی بات نہ تھی ، وہ اُس سے ڈرتی تو نہیں تھی ۔ نا ہی ایسی گئی گزری تھی ، کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ لیتا ۔ مگر پھر بھی جانے کیا تھا ۔ ؟

وہ بولڈ خاصا تھا ۔ حرکتیں بھی ایسی کرتا ۔ باتیں بھی ۔ کہ اُسے پکڑا نہیں جاسکتا تھا ، کم از کم سزا نہیں دی جاسکتی تھی ۔ اُس کی شخصیت ہی ایسی تھی شاید ، مدبّر سی بارعب سی ۔ کتنا تضاد تھا ۔ اُس کی حرکتوں میں ۔ اور اُسکی شخصیت میں ۔

بی اے میں مسلسل فیل ہو رہا تھا ۔ عین لوفروں والی حرکتیں کرتا تھا ۔ مگر پھر بھی اگر مُنہ سے چُپ رہے ۔ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے ۔ تو شخصیت ضرور متاثر کُن تھی ۔

" تم اُس کی شخصیت سے متاثر نظر آتی ہو " کل ہی صوفیہ معنی خیز انداز میں کہہ رہی تھی ۔

" اوہ ! پلیز صوفیہ ۔ میں نے صرف بات کی ہے ایک حقیقت کہی ہے ، اُس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ۔ "

" ایسی لوفروں والی حرکتوں اور غنڈوں والی باتوں کے بعد وہ تمہیں بُرا ضرور لگنا چاہیئے " ۔

" تو میں نے کب کہا ہے ۔ کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے ۔ "

" تم کہتی ہو وہ بی اے میں مسلسل فیل ہو رہا ہے ۔ "

" اور یہی میری کمزوری ہے ۔ میں نالائق انسان ایک لمحے کو بھی برداشت نہیں کرسکتی

"اس کا مطلب ہے وہ فیل نہ ہوتا رہتا تو تم اُسے برداشت کر لیتیں۔؟"

"شاید سوچ لیتی کچھ"۔ وہ شرارت سے بولی تھی۔

"اور اب؟"۔

"Vacancy no"۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا "تو تمہارے لئے کوئی ایسا لڑکا ہونا چاہیئے جو فیل کبھی نہ ہوا ہو"۔

" اوّل تو میں نے اس پہلو پر کبھی سوچا نہیں۔ لیکن اگر کبھی سوچنے کا اتفاق ہوا بھی۔ تو۔ یہ میری پہلی شرط ہوگی۔" اس نے سچائی سے کہا تھا۔

" تو اس بار اُسے نقل وقل دلا دو پاس ہو جائے گا"۔

"اب گاڑی نکل چکی ہے۔ میری کتاب میں فیل ہونا لکھا ہی نہیں"۔

"ہیئر ہیئر"۔ صوفیہ نے تالی بجائی تھی۔

" پھر اس بچارے کا کیا بنے گا۔؟" قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی تھی۔

"میں نے تمہیں اُس کی عجیب و غریب حرکتیں بتائی ہیں۔ کوئی سفارش نہیں پائی تھی"۔

" تو پھر اتنے لمبے چوڑے تمہید کا مطلب؟"۔

" بھئی پڑوس میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ یا تمہاری دوست پر جو بیت رہی ہے۔ اُس کی تفصیل ہی بتائی ہے۔ آگے کیا ہوگا؟ تمہیں دُبلا ہونے کی ضرورت نہیں"۔

" یعنی کہ دبلا ہونا تمہارے ذمّے"۔

"بس پلیز صوفیہ! اب مذاق ختم۔ اُس کی حرکتیں لوفروں والی ہیں۔ اور اُس کی شخصیت اُس کے حرکات کی تردید کرتی ہے۔ میں یہی کہنا چاہتی تھی اور بس"۔

" ہو سکتا ہے اُس کی یہ حرکتیں غیر ارادی ہوں۔ تمہیں دیکھ لیتا تو سقراط بھی

عقل کھو دیتا" صوفیہ کہنے لگی "وہ نہیں پسند کرتا ہے اور اسی وجہ سے یہ سب کر رہا ہے"۔

"کیا کہتے ہیں پسند کے بھی۔ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی معقول طریقہ اختیار نہیں کرسکتا؟ کوئی decent طریقہ؟ وہ تو بعض اوقات ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ بس۔ بالکل تھرڈ کلاس عاشقوں کی طرح۔ اور پھر فیل شدہ عاشق کی میں قائل نہیں۔ یہ بحث اب ادھر ہی ختم ہو جانا چاہیئے"۔

"فیل ہو گیا تو کیا ہوا؟ کتنے ہی لوگ فیل ہوتے ہیں۔ پھر آخر کار پاس ہو کر اچھی پوسٹ پر لگ جاتے ہیں۔ بعد میں کون پوچھتا ہے کہ پڑھائی کے دوران کیا حال تھا؟ دیکھا تو اس کی ظاہری پوزیشن کو ہی جاتا ہے"۔

"مجھے اچھی پوسٹ اور ظاہری پوزیشن نہیں چاہیئے۔ ایک decent Brilliant انسان چاہیئے اور بس۔"

"تو یہ بچارا مفت میں ہاتھ پیر توڑ رہا ہے؟"

"یقیناً"۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

لیکن۔ اس کے باوجود وہ اس سے خائف تھی۔ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اُسے پسند کرتا ہے۔ پھر یہ حرکتیں؟ معنی خیز نظریں۔؟؟ یہ سب کیا تھا؟ مذاق شاید۔ تو کیا وہ اس قابل تھی کہ اُس کے ساتھ مذاق کیا جائے؟ اس کا مطلب تھا۔ وہ کچھ سمجھتا تھا اپنے آپ کو اہم چیز غالباً۔

"ہونہہ"۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "D.C کا بیٹا ہوگا تو اپنے لئے"۔ یوں چھپ کر بیٹھ جانا اُسے اپنی شکست معلوم ہوئی۔ اُٹھ کر اس نے منہ ہاتھ

دھوئے۔ ڈریسنگ روم میں جاکر وارڈ روب کھولا۔ خوبصورت لال رنگ کے
کمونو پر نظر پڑی۔ یہ پچھلے سال باباجان اُس کے لئے جاپان سے لائے تھے اُس
نے وہی نکال لی۔ ڈریس اپ ہوکر اُس نے سنہرے خوبصورت بال کھلے چھوڑ
دیئے۔ پاؤں میں سرخ جرابیں پہن کر اُس نے نرم سے چپل پہنے۔ اور
اعتماد سے چلتی کمرے کا دروازہ کھول کر ٹیرس کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"لے گئی دِل گڑیا جاپان کی۔ لے گئی دل گڑیا جاپان کی"۔

پوری سپیڈ سے انڈین سنگر چیخ اُٹھا۔ جیسے اُس کے باہر نکلنے کا تو منتظر تھا
سا تھ۔

میں اُس نے دیکھا۔ ٹیرس سے چند ہی قدم پر سبزیوں کی کھیتیوں میں وہ ٹیپ
ریکارڈر کے قریب کھڑا گانے کے بول کے ساتھ ساتھ دل سے بے کریزلس تاکس
ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر ایکٹنگ کئے جا رہا تھا۔

جانے کیوں؟ وہ بوکھلا سی گئی۔ اتنے قریب سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے
وہ عجیب مضحکہ خیز سی ایکٹنگ کئے جا رہا تھا۔ ایک
پل کو تو اُس کا جی چاہا۔ واپس بھاگ جائے۔ اور اُس نے واقعی رخ
واپس موڑ لیا۔ قدم بڑھایا ہی تھا کہ گانے کے بول بدل گئے۔

" جھٹک کے دامن چلی ہو تن کے"۔ وہ شکست ماننے کو تیار نہ ہوئی۔
رُخ موڑے موڑے ہی بجائے کمرے کے نیم حویلی کے سیب کے باغ کی طرف
ریلنگ کے پاس جاکر رک گئی۔

" ٹھہر گئی کیوں دو قدم پہ جا کے۔ دو قدم پہ جا کے"

"خبر ہے مجھ کو ہے پیار تجھ کو"۔
اوہ ۔ آج کس انوکھے طریق سے اُس نے اُسے اَن کہا کہا تھا۔ کہ "نہ جانے
مانے نہ پائے رنگت" والی بات ہو رہی تھی۔
گانے کے بول پھیر بدل گئے تھے۔
"الفت نہ سہی نفرت ہی سہی۔ اس کو بھی محبت کہتے ہیں"۔
"تو لاکھ چھپائے بھید مگر ہم دل میں سمائے رہتے ہیں"۔
تو اُس نے مختلف گانوں کے چیدہ چیدہ بول ٹیپ کرائے تھے؟ وہ انجان
سی بنی اُسکی طرف پیٹھ کئے سامنے سیب کے درختوں پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔
اندر واپس جاکر اپنی شکست مان لینا اُسے کسی طور منظور نہ تھا۔
"کھلی پلک میں جھوٹا غصہ۔ بند پلک میں پیار۔ کہنا بھی مشکل۔ رہنا بھی مشکل"۔
جانے کیوں؟ اُس کی اس اوٹ پٹانگ حرکت پر اُسے ہنسی آنے لگی۔ وہ
یقیناً ان بولوں کے ساتھ بھی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ وہ دیکھ تو نہیں رہی تھی مگر
اُس سے یہ امید ضرور رکھتی تھی۔
"میرے پاؤں میں گھنگھرو بندھا دے۔
تو پھر میری چال دیکھ لے"
اچانک ہی سپیڈ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اور اس کا رخ غیر ارادی
طور پر اس کی طرف پھر گیا۔
"اوہ"۔ وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی۔
کمر میں کس کر سکارف باندھے وہ بڑے زور سے ٹھمکا لگا رہا تھا۔

اُسے یہ کھیل خاصا دلچسپ معلوم ہُوا۔ اطمینان سے رخ اُس کی طرف کر کے وہ اُسے دیکھنے لگی۔ وہ اُس کا کیا بگاڑ رہا تھا؟ خود ہی کٹھ پتلی بنا ہُوا تھا۔

"میں تیرے پیار میں کیا کیا نہ بنا دلبر۔ جا۔ یہ موسم۔ جانے یہ موسم" اب پھر وہ اس کی طرف اشارے کر رہا تھا۔

"تیرے بھی دل میں آگ۔ اُٹھی ہے جاگ۔ زبان سے چاہے نہ کر اقرار" اس نے قریب بندھے ڈبنے کو اس طرح سہلا سہلا کر ردیف کے ساتھ سُر ملایا کہ کیا دلیپ نے اپنے گھوڑے کو سہلاتے ہوئے ردیف کا ساتھ دیا ہوگا۔

"خدایا کیا چیز ہے یہ آدمی بھی"۔ اُسے پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں۔ اور چابی کھو جائے"۔ اُس کی ایکٹنگ اتنی عجیب تھی۔ اور نظریں۔

اتنی معنی خیز کہ وہ ساری ہنسی بھول بھال گئی۔ دھیرے سے چلتی کمرے کی طرف بڑھی۔

بول پھر بدل گئے تھے۔ کمرے میں آکر وہ آرم چیئر پر ڈھیر ہو گئی۔

"کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جانِ تمنا۔

"بھیگے ہوئے موسم کا مزہ کیوں نہیں لیتے؟"

ٹیپ ریکارڈر سے گانے کی آواز آنے لگی۔ پھر یکلخت ہی جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے اُس نے دیکھا۔ ٹیپ ریکارڈر ہاتھ میں لئے کوٹ کندھے پر لٹکائے وہ اپنے برآمدے کی طرف جا رہا تھا۔

اُس نے ایک گہری تھکی سی سانس لی۔ کیسے کیسے بول اُس نے ٹیپ کرائے تھے؟
یقیناً اُسی کی خاطر یہ ساری تردّد کی تھی۔ پھر وہ اس عجیب سے اتفاق پر حیران بھی
ہوئی۔ کہ اُس نے کموتو بھی پہن رکھی تھی۔ اور اس کا پہلا گانا بھی یہی تھا۔ پھر وہ مڑ
کر آنے لگی تھی۔ تو بھی گانا اُس کے حسب حال تھا۔ باقی تو خیر۔
نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پھر ہنس دی۔ کیسی عجیب عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کرتا
تھا یہ آدمی۔
چند دن قبل بھی اُس نے اُسے کموتو پہنے دیکھا تھا۔ اُس کے بعد ہی شاید
یہ گانا ٹیپ کرایا تھا۔
شانی کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر اُس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر اب بھی
ہنسی آرہی تھی۔
پھر دوبارہ وہ ٹیرس پر نہیں گئی۔ وہ حد سے بڑھ رہا تھا۔ اور وہ —
واقعی آہستہ آہستہ ہمت کھو رہی تھی۔ اس کا سامنا کرنے کی۔ وہ شام اُس
نے P. G. Wode House کی JEEVES پڑھتے پڑھتے گزار دی۔
کھانا کھاتے ہی وہ بستر پہ دراز ہوگئی۔ آج اس کا سونے کا موڈ ہو
رہا تھا۔ کل چھٹی تھی۔ چاہتی تھی جلدی سوئے۔ اور صبح دیر تک سوتی رہے۔
کالج میں بھی آج بہت تھک گئی تھی۔ بریک کے بعد کوئی کلاس نہیں ہوئی تھی۔
اور وہ تمام وقت ٹینس کھیلتی رہی تھی۔ ٹانگیں تھک کر چور ہوئی تھیں۔
لائٹ آف کرتے ہوئے وہ نرم و گرم بستر میں گھس گئی۔ اور منٹوں میں ہی
نیند نے آلیا۔

"ٹرر... رن ٹرن"۔ یکبارگی سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ کوٹھی کے نچلے حصّے میں باباجان کا ٹیلیفون سیٹ ہوتا تھا۔ وہ انہی کے لئے مخصوص تھا۔ اُس کے لئے اور باقی پرائیویٹ کاموں کے لئے باباجان نے ایک اور سیٹ لگوا دیا تھا۔ جسے وہ اپنے ہی بیڈ روم میں رکھا کرتی تھی۔ "ہیلو ثنا سپیکنگ"۔ وہ نیند سے بوجھل آواز میں بولی۔ "اوہ آپ سو رہی تھیں؟" کسی مردانہ آواز نے نہایت رومینٹک انداز میں آہستہ سے دریافت کیا۔

"کس سے بات کر رہی ہیں؟" وہ تند لہجے میں بولی۔

"آپ سے"۔ لہجہ بہت آہستہ اور مزید رومانوی ہو گیا۔

"کیا نام ہے؟"

"کچھ نہیں"۔ اُسی لہجہ میں جواب ملا۔

"تو بند کر دیں"۔ ساتھ ہی اُس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ جانے پھر کون کمبخت ہے؟ ذرا نمبر ہاتھ لگ جائے اور عورت کی آواز سنائی دے جائے۔ بس پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں اُسے کوستی پھر خوبصورت نرم لحاف میں گھس گئی۔

تھوڑی دیر نیند کی کوشش میں کروٹیں بدلتی رہی۔ مگر جلدی ہی آنکھ لگ گئی۔

"ٹرن ٹرن"۔ وہ گھبرا کر جاگ اُٹھی۔

ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو"

"آپ جاگ رہی ہیں اب تک؟"۔ وہی عاشقانہ مدھم آواز اُبھری۔

"شٹ اپ"۔ اُس نے فون بند کر دیا۔
ابھی لیٹ کر لحاف اپنے اوپر ٹھیک کیا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بج اٹھی۔
"STUPID" وہ بڑبڑاتی ہوئی پھر بستر میں بیٹھ گئی۔
ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔ بالکل خاموشی سے بولی کچھ نہیں۔
"ہیلو"۔ وہی آواز آئی۔ بہت آہستہ سے۔
وہ خاموش رہی اب بھی۔
"ہیلو۔ بات کیجئے نا"۔
"ہیلو۔ دیکھئے آپ کی سانس کی آواز مجھ تک آ رہی ہے۔ اور آپ نہیں بول رہیں"۔
شانی کو سخت کراہت آئی۔ مگر جواب اب بھی نہیں دیا۔
"ہیلو"۔ اُسی آواز نے بالکل مدھم سی سرگوشی کی۔
اور اس کا دل چاہا۔ وہ سامنے ہو۔ اور وہ اس کا منہ نوچ لے۔
"ہیلو۔ مجھے پہچانا آپ نے؟" وہ چونک اُٹھی۔
وہ پہلی بار نارمل آواز میں بولا تھا۔ اور اس کی آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی۔
مگر وہ اب بھی چپ رہی۔
"ہیلو۔ بات کیجئے نا۔ ناراض ہیں کیا۔ میں تو آپ کے لئے کیسے کیسے پاپڑ کھیلتا رہتا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتیں"۔
"اوہ۔ تو آپ ہیں"۔ اُس کے منہ سے نکلا

اور ساتھ ہی اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھدیا۔

اس کے بعد ہی رنگ ہوتے۔ مگر اُس نے ریسیو نہ کیئے۔ رات ساڑھے بارہ بجے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ تنگ آکر اُس نے پلگ ہی نکال دیا۔ اور پھر پہروں اُسے نیند نہ آئی۔ پر ایک بات ضرور تھی۔ شروع میں جب اُسے معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کون ہے؟ وہ غصّے سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل بھی کوئی بار بار فون کرکے اُسے تنگ کیا کرتا تھا۔ اُسے بھی اُس نے کھرّے جواب دیئے تھے۔ اور پھر اُس نے واقعی دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

آج عرصہ بعد ایسا ہوا تھا۔ پھر اس کا خون کھولنے لگا تھا۔

مگر جوں ہی اُسے معلوم ہوا۔ یہ ڈی سی کا بیٹا ہے اس کا غصّہ جاتا رہا تھا۔ بلکہ جانے کیوں؟ اُسے تو یہ بھی اُسکی اوٹ پٹانگ حرکتوں میں سے ایک لگی تھی — ساتھ میں کچھ اطمینان سا بھی ہوا کہ وہ کوئی اور نہیں تھا۔ بہر حال اس کا پڑوسی تھا۔ جو تنگ تو ضرور کرتا تھا۔ مگر تھا بے ضرر قسم کا۔ پھر

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اگر وہ اُسے کھرّے جواب دے بھی دیتی۔ بلکہ دے بھی چکی تھی۔ تو اُسے کیا خاک اثر ہونا تھا؟ وہ بھلا کسی دھمکی یا ڈانٹ کی پرواہ کرتا تھا؟ اُس کا

سراپا اُس کی نظروں میں گھوم گیا۔

لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ مسحور کن شخصیت۔ کیسی زبردست PERSONALITY پائی تھی۔ اُسے لوگوں کی کہی ہوئی بات کہ شخصیت سے

ہی انسان کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے ۔سراسر غلط لگی ۔اس کی شخصیت پرتو بڑے بڑے دھوکہ کھا سکتے تھے ۔ایسی DASHING PERSONALITY تو کم ہی لوگوں کے نصیب میں آئی ہوگی ۔سوچتی ہوئی وہ آخر کار سو ہی گئی ۔

۱۲

شاید یہ پہلا موقعہ تھا ۔کہ دل چاہتے ہوئے بھی وہ دو دن سے ٹیرس پہ نہیں جا رہی تھی ۔اُسے تو اس جگہ سے عشق تھا ۔شام کے وقت کسی اور جگہ بیٹھی تو اُسے بے چینی سی ہونے لگتی ۔

برف پڑنے کی الگ بات تھی ۔تب ضرور مجبوری ہوتی اور وہ سردیوں کی منجمد شامیں اپنے کمرے میں بڑی بڑی جلتی ہوئی لکڑیوں کے آگے بیٹھ کر گزارا کرتی تھی ۔مگر ۔

آجکل اتنی بے حد حسین ،رنگین ، شامیں وہ کیونکر اندر کمرے میں بند رہ کر گزار سکتی تھی ؟۔کوٹھی کے سامنے کی طرف نہ ایسا سکون میسّر تھا ، نا ہی اطراف اتنے حسین تھے ۔پھر نوکر چاکر ۔آنے جاتے والے لوگ ہوتے تھے ۔پرائیویسی بالکل نہیں ہوتی تھی ۔مگر اُس طرف ۔

وہ بھی تو اُسے سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا ۔ماما موجود ہوتیں تو پھر کچھ نسبتاً ٹھیک رہتا تھا ۔مگر ماما بھی ہر شام ضروری نہیں تھا کہ فارغ ہوں اور اس کا مکمل ساتھ دیں ۔ ۔

اُسے پچھلے دن یاد آ گئے۔ جب یہ ڈی سی ابھی نہیں آیا تھا۔ کتنا سکون ہوتا تھا۔ اور اب۔

وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ اب وہ مزید اس کا سامنا نہ کر سکے گی۔ وہ حد سے باہر ہو رہا تھا۔ اخلاق کے تمام حدود پھلانگنے پہ تلا نظر آ رہا تھا۔

آج تیسرا دن تھا اُسے کمرے میں نظر بند رہے۔ گھبرا کر اس نے صوفیہ کو فون کر کے بلا لیا۔ کچھ گپ شپ ہی ہو جاتی۔ اور پھر

اس کے آنے تک وہ تیار ہونے لگی۔ سفید اور نیلے رنگ کا گرم چیک سوٹ پہن کر اس نے نیلے شفون کا دوپٹہ لیا۔ اور نیلا ہی پوری آستین کا سویٹر پہن لیا۔ نیلی جرابیں پہن کر سفید بوٹ پہنے۔ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی بنائی۔ فریش ہونے کے لئے لباس پر یوڈی کلون کی سپرے کی۔ اور آرام چیئر پہ نیم دراز ہوتے ہوئے پاس رکھا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ آج پھر اس کا ٹیرس پر جا کر بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"ہیلو سنائی"۔ صوفیہ اچانک ہی نمودار ہوئی۔

"ہیلو صوفیہ" وہ رسالہ رکھتے ہوئے خوش ہو کر بولی"۔ بور ہو رہی تھی اکیلی سوچا تمہیں بلا لوں۔ باتیں کریں گے۔ بوریت جاتی رہے گی"۔

"ہاں میرا بھی دل چاہتا تھا تمہیں اپنا نیا لیمپر سوٹ دکھاؤں سو پہن کر آئی ہوں"۔ وہ اِرد گرد گھومتے ہوئے، شرارت سے اُسے سوٹ کے مختلف زاویے دکھاتے ہوئے بولی۔

"بیوٹی فل۔ بہت سمارٹ لگ رہی ہو اس میں"۔

"اب بتاؤ نہیں۔ تیاؤ بلایا کیوں تھا؟"۔ وہ کھڑے کھڑے بولی۔

"تیا بیٹھو دیا بور ہو رہی تھی۔"

"اتنے زندہ دل پڑوسی ہوں۔ اور لوگ بور ہو جائیں۔ میں نہیں مانتی۔"

اور شائی اُس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بتاؤ نا ٹھیک ٹھیک"۔

"بھئی تم آخر کہلوانا کیا چاہتی ہو۔ کہہ تو دیا ہے بور ہو رہی تھی۔"

"یہ کافی نہیں ہے۔ آؤ ٹیرس پر جا کر بیٹھیں۔ ماما سے کہو مزیدار سی چائے پلائیں۔ اور پھر چائے پیتے پیتے میں تم سے مطلب کی بات اُگلوالوں گی۔"

"ٹیرس پر بیٹھنا کیا ضروری ہے۔ خنا میں یخ ہو رہی ہیں۔ یہیں بیٹھتے ہیں۔"

"تم تو کہا کرتی تھیں۔ یخ منجمد کر دینے والی شامیں ہوں۔ بادل ہوں۔ اور تم ہو۔"

"میں تو اب بھی یہی کہتی ہوں"۔ اُسے تو عشق تھا ایسے ماحول سے۔ اس کا جی للچایا۔ مگر۔

"آج یہیں ٹھیک ہے"۔ وہ پھر کترانے لگی۔

"نہیں اور بالکل نہیں"۔ وہ اُسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے زبردستی ٹیرس پر کھینچ لائی۔

آج خلافِ معمول آسمان صاف تھا۔ ہوا خنک تھی۔ سبزہ نکھرا ہوا، پہاڑ دُھلے دُھلے۔ اور ندی کا پانی مغرب کی طرف جاتے سورج سے سونے کا رنگ چرائے لیئے جا رہا تھا۔

دونوں لوہے کی تار کی سفید سُبک کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ بہت دنوں کے

بعد سنہری دھوپ آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

"تمہارا 'وہ' نظر نہیں آ رہا"۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد صوفیہ اپنے مطلب پر آ ئی۔

"تمہارا" وہ" ہو گا نا"۔

"میری ایسی قسمت کہاں؟"

"اب وہ ایسا بھی نہیں ہے کہ قسمت اُسے ڈھونڈتی پھرے"۔ اُس کا سراپا اُس کی نظروں میں گھوم گیا۔ اور اُسے اپنی بات میں کچھ غیر صداقت سی سی نظر آئی۔

"مگر وہ نظر نہیں آیا"۔ صوفیہ پھر بولی۔

"پلیز۔ نام نہ لو ورنہ شیطان کی طرح حاضر ہو جائے گا"۔

"تمہیں دیکھتے ہی نکل آتا ہو گا بل سے"۔

"بل سے نہیں نکلتا۔ وہ تو بہت دھوم دھڑکے سے نکل کر آتا ہے"۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ایسی ویسی معمولی چیز نہیں ہے"۔

"تو یہ بات ہے"۔ صوفیہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"تم کچھ بھی کہو حقیقت اپنی جگہ ہے۔ کبھی دیکھو گی اپنی آنکھوں سے۔ میں نے اتنا بولڈ شخص آج تک نہیں دیکھا۔ باپ سے شکایت بھی کر دی۔ ڈانٹ بھی پڑی مگر اُسی شام وہی کا وہی تھا۔ بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر۔۔۔"

"اوہ۔ وہ دیکھو۔ وہ تو نہیں؟" صوفیہ اچانک ہی بالکل سامنے مرمریں برآمدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

" وہی ہوگا"۔ اُس نے رُخ موڑے بغیر کہا۔ مگر۔ دِل بلاشبہ بے ترتیب ہو کر دھڑک اُٹھا۔

" مگر ایک ہاتھ میں ٹینگ دوسرے میں ڈوری ہے۔ پیچھے پیچھے ایک اور بھی لڑکا ہے"۔ صوفیہ کچھ حیرت سے بولی۔

" بس وہی ہے۔ وہ ہی آگے آگے رہتا ہے۔ دوسرا بچارا تو بہت شریف سے اپنے برآمدے سے کبھی ایک قدم بھی اس طرف نہیں بڑھایا۔ یہ ہی اُچھلتا کودتا رہتا ہے۔ بس چلے تو ریلنگ ہی پھلانگ کر آجائے"۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ خائف سی۔ سہمی سی۔ جانے کیا گل کھلانے والا تھا آج؟۔

" مگر ہے خاصا DASHING"۔ صوفیہ متاثر سی نظر آنے لگی۔

" کہو تو پیغام بھجوا دوں؟"۔

" نہیں نہیں تمہیں ہی مبارک ہو۔ میں نے اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے ہیں۔ میرے لئے اپنا ندیم ہی کافی ہے"۔ اُس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اور ندیم مقامی بینک میں اسسٹنٹ مینیجر تھا۔

" اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے سے کیا مطلب؟" وہ ہنس دی۔

" یہی کہ میرے ساتھ ایک بنک کا اسسٹنٹ مینجر ٹھیک لگتا ہے اور تمہارے ساتھ یہ"۔

" تو یہ کون سی آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق ہے؟"۔ وہ کچھ طنز سے بولی۔ جانے کیا بات تھی؟ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ بی، اے میں فیل ہونے کے باوجود۔ بوفروں جیسی حرکتیں کرنے کے بعد بھی وہ ایک خاص قسم کی۔

زبردست (PERSONALITY) رکھتا تھا۔ ایسی کہ۔ جو۔

فوراً متاثر کرلے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ متاثر ہونے سے کترا رہی تھی۔

وہ بی اے میں فیل ہو رہا تھا۔ اور اُسے ایسے لوگ جانے کیوں اچھے نہیں لگتے تھے، بلکہ یہ بات بھی نہیں تھی، اس کی کئی فرینڈز ایسی تھیں جو کہیں نہ کہیں فیل ہوئی تھیں۔ مگر اُسے اُن سے پھر بھی بہت لگاؤ تھا۔ پھر کیا تھا؟۔

شاید اس کا آئیڈیل مرد اُسے فیل ہوتا اچھا نہیں لگتا تھا۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں اس کا آئیڈیل ایک لائق بلکہ BRILLIANT مرد تھا۔

یہ بھی شاید۔ اس لئے تھا، کہ خود وہ بہت Intelligent تھی۔ کے جی۔ سے لے کر اس وقت تک اپنی کلاس میں فرسٹ آتی رہی تھی، سوائے ایک یا دو دفعہ کے۔ اور ہر بار اُسے یاد ہے وہ بہت روئی تھی۔ اور بابا جان سے ڈانٹ الگ پڑی تھی یہی وجہ تھی شاید۔ بہرحال۔

"آسمان سے اُتری نہ سہی۔ پریشانی! قسم اُٹھا کر کہو۔ اس کے بے انتہا ہینڈسم ہونے میں بھی تمھیں شک ہے؟"

"Handsome is that Handsome Does" اس نے دھیرے سے کہا۔

"وہ سب ایک طرف چھوڑو۔ تم میری بات کا جواب دو۔ کیا اس کی شخصیت بہت پرکشش نہیں ہے؟" صوفیہ ہنوز اس پر نظریں جمائے سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"ہوگی۔ میں نے غور نہیں کیا" یہ جیکہ

وہ اپنی غلط بیانی صاف محسوس کر رہی تھی۔ صوفیہ دیکھ رہی تھی۔ کہ اس دوران اس نے ایکبار بھی پیچھے مڑ کر اُسے نہیں دیکھا۔

"لو اس نے تو پتنگ اُڑانا شروع کر دیا۔" صوفیہ مزید حیرت سے بول پڑی اور شائی کھلکھلا کر ہنس دی

"آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟ پتنگ اُڑانا کوئی ایسی قابل گرفت حرکت تو نہیں۔"

اور صوفیہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر ریلنگ تک لاتے ہوئے دلچسپی سے سامنے دیکھنے لگی۔

آج اس کے ساتھ دوسرا لڑکا بھی پتنگ اُڑا رہا تھا مگر وہ دور بادام کے باغ والی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ اور یہ —

ٹیرس کے قریب سبزیوں کی کھیتوں میں —

دونوں کے پتنگ ہواؤں کے دوش پر اوپر ہی اوپر اُڑے جا رہے تھے دوسرا تو بچارا جانے کچھ کہہ بھی رہا تھا یا نہیں۔ مگر اس کا شور واویلا شروع ہو گیا۔

"وہ مارا۔ وہ مارا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے لڑکے کی پتنگ کو کاٹنے کی کوشش میں بھی لگا ہوا تھا۔ اگرچہ دوسرے کی بھی کوشش یہی تھی کہ اس کی پتنگ کاٹ گرائے مگر منہ سے بالکل خاموش تھا۔ شاید لیڈیز کی موجودگی ملحوظ خاطر تھی۔ اور یہ؟ اسے کب کسی کی پرواہ تھی؟ —

پھر اُس نے وہ شور مچایا۔ وہ شور۔ کہ الامان۔ صوفیہ مارے ہنسی کے دوہری ہو رہی تھی۔ اور شائی بھی یقیناً محظوظ ہو رہی تھی۔ مگر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی شاید۔ یا دوسرے لفظوں میں شکست کی قائل نہ تھی۔ کھیل کافی دلچسپ تھا۔ مگر طویل بھی۔ وہ صوفیہ کو لے کر سیڑھیاں اُترتی پانی میں اُتر گئیں، دونوں چبوترے پر کھڑی دور جاتی ندی کو دیکھ رہی تھیں۔ تبھی
شائی شور سے چونکی۔

"وہ کاٹا۔ وہ کاٹا۔۔۔" ساتھ ہی وہ سیڑھیاں اترتا نمودار ہوا۔ اس طرح۔
کہ نظریں کبھی اوپر آسمان کی طرف اپنی پتنگ پر اور کبھی نیچے سیڑھی پر تھیں۔ مگر آدھا انہی کی طرف رہا تھا۔

وہ پھر گھبرا گئی۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی۔ جان بوجھ کر ان کی طرف آیا تھا۔ "ذرا اور ذرا اور۔۔۔" وہ ڈوری کو جھٹکے دیتا اُن کے پاس چوڑے چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ صوفیہ حیرت ملی دلچسپی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے جیسے چونکتے ہوئے ایک نظر ان پر ڈالی۔
"ہیلو"۔ اُس نے قدرے جھجکتے ہوئے بہت شائستگی سے صوفیہ کو "ہیلو" کہا۔

"ہیلو"۔ صوفیہ مرعوب سی نظر آنے لگی۔
"اوہ آپ بھی ہیں"۔ وہ پھر شوخ ہو گیا۔
شائی کی آنکھوں میں بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ یوں بولا۔

جیسے ابھی اُس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔
اور وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔
"تنگ اڑاتی ہیں کیا؟" اُس نے زبردستی تنگ کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کا وہی ہاتھ پکڑا اور دوسرے سے تنگ کی ڈوری پکڑ کر اڑانے لگا۔
صوفیہ ہنستے ہوئے قدرے پیچھے ہٹ گئی۔ خاصا دلچسپ آدمی تھا اس نے سوچا۔ شائی نے تو کچھ اور ہی تصویر اس کی پیش کی تھی۔ اس کے سامنے۔
"اڑائیے نا۔" ہاتھ میں پکڑا شائی کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
اور شائی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ "ارے۔ کافی بد ذوق ہیں آپ تو"۔ وہ پھر مصروف ہو گیا۔
"وہ کاٹا" وہ اچانک پیچھے ہٹتے ہوئے زور سے چلایا۔
صوفیہ نے دیکھا اُس نے واقعی دوسرے لڑکے کی تنگ کاٹ دی تھی۔ مگر پھر۔
وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ تنگ کاٹتے کاٹتے وہ اس زور سے پیچھے ہٹا تھا کہ شائی کو پھلانگتا ہوا اور خود شائی سے جا ٹکرایا تھا۔ اور مزہ تو یہ تھا کہ ہنوز اُسی حالت میں کھڑا بے نیازی سے اپنی تنگ کی ڈور لپیٹتا اور یہ آسمان سے گرتی کٹی ہوئی تنگ کو دیکھ رہا تھا۔
صوفیہ نے ایک نظر شائی کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اُسے پرے

دھکیل رہی تھی - جبکہ جواب میں وہ اُتنی ہی قوّت سے واپس اس پر گرا جا رہا تھا۔
صوفیہ اپنی ہتک مزید برداشت نہ کر سکی - اور آگے بڑھ کر سیڑھیاں چڑھتی اُوپر جانے لگی۔

"ہٹیے میرے آگے سے"۔ وہ سختی سے بولی۔

"وہ دیکھیے چلی آ رہی ہے تینگ"۔ وہ اَن سنی کرتے ہوئے تینگ کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

"میں کہتی ہوں آپ ہٹ جائیں میرے آگے سے"۔ ساتھ ہی وہ اُسے پھر دھکیلنے لگی۔

"آپ کے ہاتھ بہت نازک ہیں"۔ وہ اب بھی نظریں تینگ پر جمائے ہوئے تھا۔

"ہٹیے نا"۔ اُس کے لہجے میں بے بسی عود کر آئی۔
کیسا انسان تھا یہ؟ اُس کے ہاتھ تو واقعی بہت کمزور اور وہ درحقیقت بہت مضبوط تھا۔

کامران اُس کے لہجے پر چونکا۔

"واقعی ہٹ جاؤں؟"۔ یکدم ہی سیدھا ہوتے ہوئے اُس نے رخ اُسکی طرف کر لیا۔

اور شائی اس کے ہٹتے ہی کوئی جواب دیئے بنا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔
"ناراض ہو گئیں ہیں"۔ اس کے سامنے آ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے اُس نے مزید پوچھا۔

شانی کی جھکی پلکیں اُٹھیں۔
"اوہ"۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ وہ اُس کا مقابلہ نہ کر پائی تھی، جبھی شاید اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔
"I am sorry" وہ پہلی بار تاسف سے بولا۔
"بابا جان آئیں گے تو میں سب بتا دوں گی"۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
اُس کی آواز میں شکست کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ واقعی اس کا مقابلہ نہ کر پائی تھی۔ اُس کا لہجہ اُس معصوم بچے کا سا ہو رہا تھا۔ جو اپنے سے زیادہ طاقت والے کا خود مقابلہ نہ کر سکنے کے بعد اپنے باپ کی دھمکی دینے لگا ہو۔ اپنی ہی ذات سے وہ اُسے دھمکا سکتی تھی جیسے۔ خود تو جیسے ہار گئی تھی۔
"I am really sorry" "پلیز!" وہ بے چین سا بول اُٹھا۔
وہ اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اُسے واقعی افسوس ہوا تھا۔ پہلی بار جاتے کیوں؟۔
اور وہ رخ موڑے بغیر کوئی جواب دیئے بنا اپنی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔
کچھ دیر وہ اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر
چہرے پر گہرا تاسف لیے کچھ سوچتا ہوا وہ دھیرے دھیرے اپنی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

۱۳

اور پھر رات کو اُسے نیند ہی نہ آئی۔ کروٹ پہ کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے کیا بات تھی؟ اُس کی نم آنکھیں یاد آتے ہی وہ بے چین سا ہو جاتا۔ آج اُس نے اُسے بُرا بھلا بھی نہیں کہا تھا مشتعل بھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ پچھلے کئی دنوں سے وہ کچھ سہمی سہمی سی نظر آ رہی تھی۔ وہ غصہ و جلال اب نہیں رہا تھا۔ سکوٹر پر اُس کے قدموں میں جا کے گرا تھا۔ تو اس کا خیال تھا۔ اگلے دن اُسے ضرور کھری کھری سنائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

اُس نے گانے سنا سنا کر لفنگوں کی طرح اشارے کر کر کے تنگ کیا تھا۔ تب بھی وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ پھر۔

آج ــــ تو اُس نے حد ہی کر دی تھی۔ اُس پر اپنا پورا بوجھ ڈالے انجان بنا کھڑا رہا تھا۔

شاید وہ تھک گئی تھی اُسے بُرا بھلا کہتے کہتے۔ یا پھر ڈھیٹ سمجھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ مگر نہیں۔ یہ بھی نہیں تھا۔ اُس نے تو ــ اُس نے تو ــ جیسے سپر ڈال دیئے تھے۔ اُس کے سامنے۔ ہار مان گئی تھی۔ جیسے اُس سے ــ کامران کو بھی شاید اسی لئے افسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت۔ کہ اُس کا جلال، اُس کا تمدیہ ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ لوفر کہنے کا جو بدلہ وہ اُس سے لے رہا تھا۔ وہ پورا ہو گیا تھا شاید۔

وہ لاجواب ہوگئی تھی، اور خود اُس نے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا تھا تبھی ۔ شاید اُس کی آنکھیں نم ۔ اور خود وہ پشیمان ہو رہا تھا ۔

اُٹھ کر وہ لبستر میں بیٹھ گیا ۔ سرہانے رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا ۔ اور غٹاغٹ پی گیا ۔ پھر لیٹ گیا ۔

اُس کی بڑی بڑی خوبصورت شربتی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ وہ واقعی بہت نازک تھی، اُس نے اُس کے ساتھ درحقیقت بہت زیادتیاں کی تھیں ۔

یکے بعد دیگرے وہ اپنی کی گئی زیادتیاں دہرانے لگا، کبھی اُسے ہنسی آجاتی اور کبھی اُسے افسوس ہونے لگتا ۔ کیسی کیسی ایجیٹنگ کرتا تھا وہ روزانہ ۔ اُف ۔ وہ سخت حیران ہوا کیسی کیسی حرکتیں کرتا تھا وہ ۔ تہذیب سے گری ہوئی احمقانہ حرکتیں ۔ اُسے واقعی افسوس ہو رہا تھا ۔

یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا ۔ پچھلے دو تین دن سے وہ پیڑلیس پر بھی نہیں آرہی تھی ۔ اسی سے تو خائف تھی ۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا ۔

اُس نے کروٹ بدلی ۔ جاگ جاگ کر اور سوچ سوچ کر اُس کے سر میں درد ہونے لگا تھا ۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے سرہانے رکھا لیمپ آن کیا ۔ گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے ۔ وہ لبستر سے نکل آیا ۔ کمرے کی بتی جلائی ۔ روشنی ہوئی تو اُسے قدرے سکون کا احساس ہوا ۔ پھر وہ باتھ روم چل دیا ۔ پانچ بجے یوں بھی دورے پر روانہ ہونا تھا ۔ تیار ہو کر اُس نے کمرے میں ہی ناشتہ منگوایا اور پورے پانچ بجے جیپ میں بیٹھ کر چل دیا ۔

ـــ وہ پانچ دن مختلف جگہوں کا دورہ کرتا رہا ۔ تمام دن وہ مصروف رہتا

مگر رات بستر پر لیٹتے ہی اُسے وہی سوچیں آن گھیرتیں ۔
ایک ایک کرکے گزرے واقعات ۔ اپنی احمقانہ حرکتیں چھیڑ چھاڑ ۔ اُس کا اشتعال ۔ سٹپٹاہٹ ۔ گھبراہٹ اور پھر آخر کار اُس کی بے بسی ۔ آنکھوں میں جھلملاتے آنسو ۔ آنکھیں جو بلاشبہ بہت خوبصورت تھیں ۔
پھر اُسے پشیمانی کا شدید احساس ہوتا ۔ اور اس کی نیند اڑ جاتی ۔ وہ اُس سے واپس جا کر معافی مانگ لے گا ۔ وہ سوچتا ۔ اور تبھی ذہن پر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ۔
کل اُس کی واپسی تھی ۔ رات پھر بستر پر لیٹا تو اُسی کے خیالوں نے گھیر لیا ۔ پشیمانی بھی عجیب چیز ہے اُس نے سوچا ۔ کسی کل بھی تو اُسے چین لینے نہیں دے رہی تھی ۔
ایک عجیب سی خلش تھی ۔ انوکھی سی چبھن تھی ۔ بے نام سی اُلجھن تھی ۔ جو اُسے بے چین کئے ہوئے تھی ۔
شاید اس لئے کہ اس سے قبل اُس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کبھی کسی کو پریشان نہیں کیا تھا ۔ دِل دکھانا یا پریشان کرنا تو یہاں بھی اس کا مقصد نہیں تھا ۔ وہ
تو صرف اُسے تنگ کرنا چاہتا تھا ۔ اُس نے جو اُسے چھوٹتے ہی لوفر کہہ دیا تھا ۔ وہ بھی لوفر بننے کی کوشش کرنے لگا تھا محض اُسے تنگ کرنے کی خاطر ۔ ورنہ جو حرکتیں اُس نے کی تھیں ۔ اُن کے متعلق تو کبھی وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا ۔ اوٹ پٹانگ ۔ عین لوفروں والی حرکتیں ۔
اُس کی طبیعت میں شوخی ضرور تھی ۔ وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی یقیناً

تھا۔ مگر ساتھ ہی طبیعت بُردبار پائی تھی۔
اُس کی باتیں۔ جہاں زندگی کا احساس دلاتی تھیں۔ وہاں اندازِ گفتگو کا دھیما اور شائستہ پن اُسے دوسروں میں ممتاز رکھتا تھا۔
وہ یقیناً ویسا نہیں تھا۔ جیسا اُس نے کر دکھایا تھا۔ بہرحال۔ وہ جاتے ہی اُس سے معافی مانگ لیگا۔ یہ سوچ کے اس نکتے پر آ کر وہ قدرے مطمئن ہو جاتا۔
کل اُس نے واپس جانا تھا۔ اُسے خوشی ہو رہی تھی۔ جانے کیوں ؟ شاید اُس سے معافی مانگ کر ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جانے کا خیال تھا۔ اس وقت بھی اُس کے مختلف روپ اُسے تصوریں نظر آ رہے تھے۔ کبھی غصے میں۔ کبھی حیرانگی میں۔ کبھی سٹپٹاہٹ میں۔ تو کبھی گھبراہٹ میں۔
وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے
واقعی وہ کس کس طریق سے تنگ کرتا آیا تھا اُسے۔ اس وقت پھر اُس کی نیند غائب ہو گئی۔ نیند تو اکثر ہی پچھلی کئی راتوں سے اُڑ جاتی تھی۔ مگر۔ آج کی کھلی آنکھوں میں تو کچھ عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی۔ بالکل انوکھی سی۔ کچھ خوشی کی کیفیت تھی۔ کچھ انتظار کی سی۔
تو صبح گھر واپس جانے کی اُسے اس قدر خوشی تھی ؟ اتنا انتظار تھا ؟ کیوں ؟ کیا اس سے معافی مانگ کر ذہن کا بوجھ ہلکا ہونے کے خیال سے ؟۔
کیا وہ اتنی ہی اہم تھی ؟۔ کہ اُس سے معافی مانگ لیتے۔ دوسرے لفظوں میں اُسے منا لینے کے خیال سے اُسے خوشی ہو رہی تھی ؟۔ اور گھر جانے کا

کا اس قدر منتظر بھی صرف اسی لئے تھا ؟ ۔ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا ؟ بات تو یقیناً یہی تھی ۔ مگر ۔

خوشی کا یہ انداز ؟ ۔

انتظار کی یہ شدت ؟؟ ۔

باوجود کوشش کے وہ کوئی واضح حل نہ پا سکا ۔

اور پھر صبح ہی صبح اس کی آنکھ کھل گئی ۔ گھڑی دیکھی ابھی پانچ ہی بجے تھے ، وہ بستر سے اُٹھ کر باتھ روم چل دیا ۔ وہ چاہتا تو کچھ دیر اور بھی بستر میں پڑا رہتا ۔ مگر اُسے تو گھر پہنچنے کی جلدی تھی ۔

کیوں ؟ اس کیوں کا جواب تو اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا ۔ لیکن شاید قدرتی ہی ایسا ہے ۔

بہرحال وہ جلدی جلدی تیار ہوا ۔ ناشتہ منگوانے لگا ۔ تو مشکل سے چھ بج رہے تھے ۔ ڈرائیور اور چوکیدار جلدی جلدی اُس کا سامان باندھ رہے تھے ۔

پھر اُسی لمحے فون کی گھنٹی بج اُٹھی ۔ ہیڈ کوارٹر سے اس کے لئے پیغام تھا کہ وہاں سے ساٹھ میل پرے واقع قصبے کا بھی معائنہ کرتا آئے ۔

چند لمحے اُسے گہری مایوسی کا احساس ہوا ۔ کیوں ؟ یہ پھر وہ سمجھنے سے قاصر رہا ۔ بھاری سے قدم اُٹھاتا وہ کھڑکی تک آیا ۔ تھوڑی دیر بلا مقصد وہاں کھڑا رہا ۔ مگر پھر ۔

اچانک ہی مسکرا دیا ؟ ۔ گھر پہنچنے کا کیسا خبط اُس کے سر پر سوار ہوا تھا ؟ ۔ مس فصیح احمد سے اپنے رویے کی معافی مانگنے ۔ کو کتنا اہم نکتہ سمجھ لیا تھا ۔ اگر

چند گھنٹے کی تاخیر ہوگئی تو کیا ہوا ؟ مگر نہیں ؟ ۔ اس تاخیر پر وہ چونکا ضرور تھا ۔ مایوس ضرور ہوا تھا ۔ اس سے وہ منکر نہیں سکتا تھا ۔ تو بس نفیس احمد نے اُسے زیر کر لیا تھا ۔ اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر سوچا ۔ "نہیں" ۔ اپنی سوچ پر ہی وہ بڑے زور سے چونکا ۔ ایسا کیونکر ممکن ہے ؟ ۔ اور پھر

فوراً ہی کھڑکی سے ہٹ آیا ۔ بیل دبائی ۔ ڈرائیور اور چوکیدار اندر آئے ، سامان جیپ میں رکھوایا ۔ اور مزید کچھ سوچے بنا آرڈر کی تعمیل کرنے چل دیا ۔

ٹیڑھے میڑھے کچے پہاڑی راستوں پر چلتا وہ خاموشی سے باہر دیکھتا رہا ۔ ایک پل کو پھر اُسے احساس ہوا ۔ قصبے کے دورے میں اس کا وقت ضائع ہو رہا تھا ۔ مگر اُس نے پھر اس خیال کو بڑے زور سے جھٹک دیا ۔ اُسے تو اس سوچ سے ہی وحشت سی ہونے لگی تھی ۔ کچھ

دیر قبل اُس نے کیا سوچا تھا ؟

" لاحول ولا " ۔ کچھ عرصہ سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے کرتے وہ خود بھی اوٹ پٹانگ چیز بن گیا تھا شاید ۔

لیکن نہیں ۔ وہ تمام راستے اور تمام دورے میں وقفے وقفے سے چونک اُٹھتا ۔ ایک بے نام سی بے چینی اُسے مسلسل بے قرار کئے ہوئے تھی وہ فرار چاہتا تھا ۔ مگر جیسے ناممکن ہو کر رہ گیا تھا ۔

اور پھر دورہ مکمل کر کے گھر کے راستے پر روانہ ہوا تھا ۔ تو وہ واضح طور پر مسرت محسوس کر رہا تھا ۔ گھر نام ہی خوشی کا ہے ۔ پھر نعیم بھی تو تھا وہاں بہت دن بعد اُسے بھی تو ملنا تھا ۔ مگر ۔

نہیں - یہ دونوں باتیں خوش کن ضرور تھیں - مگر ایسی بھی نہیں - گھر اور نعیم کو تو وہ ہر دوسرے کے اختتام پر ملنے جاتا تھا - تب تو ایسی کیفیت کبھی نہ ہوئی تھی - پھر؟

کیا - کیا؟ - "نہیں" -

آگے وہ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا - مس فصیح احمد سے چھیڑ چھاڑ پر پشیمانی کیا ہوئی تھی - کہ اب وہ مسلسل وہی کچھ سوچے جا رہا تھا -

تمام راستہ وہ عجیب سی اُدھیڑ بن میں مصروف رہا - گولائیوں پر گھومتی چکنی سڑک پر چلتی جیپ بڑے سے آہنی گیٹ کو کراس کرنے لگی - تو وہ چونکا - پھر

اپنی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا - تو دل کچھ بے ترتیب سا ہو کر دھڑک اٹھا - جیپ بجری کی سڑک پر چلتی سیب والی پہاڑی کے دامن سے ہوتے طویل و عریض مرمریں ستونوں والے برآمدے کے سامنے جا کر رک گئی -

چھ بج چکے تھے - شام کے ملگجے سایوں میں باہر کی ہر چیز دھندلی سی نظر آ رہی تھی - سفر کے کپڑے تبدیل کر کے وہ ابھی ابھی اپنے بیڈ روم میں آ کر نرم نرم کے صوفے پر بیٹھا تھا - نعیم اس کے بالمقابل صوفے پر بیٹھا چلغوزے چھیل چھیل کر کھاتے ہوئے اسے پانچ دن کی خبریں سنا رہا تھا -

اِدھر کی - اُدھر کی - اور

گرم گرم کوفی کی چسکیاں لیتا دھیمے سے مسکراتا وہ اس کی پرشگوفہ باتیں سن رہا تھا

"اور تم نے حسب عادت اپنی بڑ دس کا حال نہیں پوچھا ہے" اچانک ہی نعیم

گویا ہوا ۔
واقعی کتنی دیر سے وہ آیا بیٹھا تھا ۔ اور اب تک ایک لفظ بھی نعیم سے اُس کے متعلق نہیں پوچھا تھا ۔ جبکہ پچھلی ہر بار وہ ضرور اس کا پوچھتا ۔ بلکہ بعض اوقات تو جیپ سے اترتے ہی نعیم کے گلے لگتے ہی ۔
" کیا حال ہے بی بڑدکسن کا ؟" وہ دھیرے سے اُس کے کان میں کہتا ۔
مگر آج اُس نے ایکبار بھی نہیں پوچھا تھا ۔ بلکہ اس وقت اُس کے اِس متوقع سوال پر تو وہ ایک پل کو گڑبڑا سا گیا تھا ۔ وہ تو فرار چاہتا تھا اس ذکر سے
" پوچھنا کیا ہے ٹھیک ہی ہوگی ۔" وہ کپ منہ سے لگاتے ہوئے آہستہ سے بولا ۔ جبکہ اُس کے ذکر سے فرار چاہنے کے باوجود وہ یہاں پہنچتے ہی چاہتا تھا ۔ کہ کچھ اُس سے متعلق سُنے ۔ جانے کیوں ؟
کیا ہو گیا تھا اُسے ؟ ؟ ذہن فرار چاہتا تھا ۔ پھر کون سا جذبہ تھا ؟ ۔ جو اُس سے متعلق کچھ سننا چاہتا تھا ۔ جاننا چاہتا تھا ۔ اُس نے سر جھٹکا ۔ کیسا وہم سا ہو گیا تھا اُسے ۔ پھر اُس نے
دزدیدہ سی نظر نعیم پر ڈالی ۔ کہیں وہ اتنی دیر سے اُسی کی طرف ہی تو نہیں دیکھ رہا ہے ۔ کہیں اُس کی سوچیں اُس کے چہرے سے تو پڑھنے کی کوشش نہیں کر رہا ؟
وہ تو نعیم سے ہی نظر دوڑا رہا تھا ۔ کیوں تھا ایسا ؟ " ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ آجکل یہاں نہیں ہے ۔"
اور کامران کی خوشی ۔ انتظار ۔ پر جیسے اوس سی پڑ گئی ۔ مگر وہ ایسا کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ اگر اُس نے پوچھ لیا ۔ " کہاں گئی ہے ؟ " تو نعیم اس کے ... کو

سمجھ لیگا۔ اگرچہ اُسے

یقین تھا کہ کوئی اس قسم کی بات نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ خائف سا ہو رہا تھا۔ دل میں کوئی چور سا تھا جیسے۔ "تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کہاں گئی ہے؟" نعیم کچھ چونکا۔ وہ

خلافِ معمول آج اس کے متعلق بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ "پوچھ لوں گا تو کیا فرق پڑ جائے گا"۔ اس کی آواز میں حسبِ عادت جھنکار نہیں تھی۔

"میں تیمور بتا دوں گا، پل لیا دیا کرو"

"مجھے کیا ضرورت ہے ملنے کی"۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے نمایاں ہو رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟ آج کچھ ناراض لگ رہے ہو اس سے؟" نعیم حیران سا ہوا۔

"میں کیوں ناراض ہوں گا۔ تم بھی بس۔۔۔۔" وہ کچھ سنبھلتے ہوئے مسکرا پایا۔

"کوئی بات ہے ضرور"۔ نعیم اس کی اندرونی کشمکش سے بے خبر ہو گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اندر ہی اندر کس اُدھیڑبن میں مصروف ہے۔ ایسے اُلجھے تاروں کی جن کا خود کامران کو سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

۱۴

رات پھر اسی اُدھیڑبن کی نذر ہو گئی۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں چند دن کے لیے کراچی گئی تھی۔ یہ اسے نعیم سے معلوم ہوا تھا۔ وقت

کے ساتھ ساتھ اُس کا خیال تھا۔ اُس کی یہ خلش انوکھی سی چبھن اور بے نام سی اُلجھن ختم ہو جائے گی۔ اب تو اس نے اُس سے معافی مانگنے کا خیال بھی ترک کر دیا تھا۔ اس کا خیال ہی اُس کے اعصاب پر اس بری طرح سوار ہوا تھا۔ کہ وہ لڑتا نظر آنے لگا تھا،

وہ کسی طور پہ شکست قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے تو اس کے ساتھ مذاق کیا تھا چھیڑا تھا تنگ کیا تھا۔ اس سے ذہنیں کہ اُس سے۔ یا اُس کی نم آنکھوں سے متاثر ہو کر ہتھیار ڈال دے اس کے سامنے۔ دوسرے لفظوں میں اُسے ۔۔۔۔ تو کیا وہ اُسے اچھی لگنے لگی تھی؟

مذاق ہی مذاق میں۔ چھیڑ ہی چھیڑ میں ۔

"نہیں" ۔ وہ بوکھلا اُٹھا۔ نہیں نہیں۔ یہ سب اُس کے پچھلے کرتوتوں کا ردِ عمل تھا۔ کہ وہ مسلسل اُسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے اُس نے کمبل ہٹائے اور بستر سے نکل آیا۔ گھڑی دیکھی ساڑھے پانچ ہو رہے تھے۔ وہ باتھ روم چل دیا۔ گرم پانی سے نہایا۔ تو طبیعت بحال ہوئی۔ ڈریس اپ ہو کر وہ کمرے میں آیا۔ چند لمحے بے مقصد کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ نعیم بھی ہوسٹل گیا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ ہر شام دو گھنٹے کے لیے، combine study کرنے ہوسٹل چلا جاتا تھا۔

وہ آہستہ قدم چلتا کوریڈور میں آنکلا۔ وہاں سے ہوتا وہ کچن کی طرف گیا۔ بیرے کو [illegible] نے کو کہا۔ اور خود پیچھے کی طرف ہاتھ باندھے بھاری سے قدم اٹھاتا برآمدے [illegible] پھر اپنے بیڈ روم کے سامنے برآمدے کے کونے میں آگیا۔

نہیں رہ سکا کہ دیا اور پڑی تھیں۔ وہ آرام سے ایک پہ بیٹھ گیا۔ سیبوں سے لدے ہوئے درختوں کو تکتا وہ اب بھی دوچیل میں کھویا ہوا تھا۔

نصیر نے چائے لا کر میز پر رکھی۔ تو وہ چونکا۔ پیالی پکڑ کر پیتے پیتے اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر سامنے اُٹھ گئیں۔ اور

تبھی اُسے لگا۔ اُسے دنوں سے بے قرار کیے عجیب سی خلش۔ انوکھی سی چبھن اور بے نام سی اُلجھن کا جواز اُسے مل گیا ہے۔ اُس کے

چہرے پر چھائی اُداسی کی چھاپ، اور آنکھوں میں لہراتے سائے سے اچانک معدوم ہو گئے۔ اُسے کچھ سکون کا سا احساس ہوا۔ اور بے قرار آنکھوں میں جیسے قندیلیں سی جل اُٹھیں۔

مس فصیح احمد ریلنگ کا سہارا لئے نیچے ندی کے پانی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

تو گھر آنے کے بعد وہ اسی کے لئے بے چین تھا؟

نصیر نے بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے تو وہ اسی لئے اداس ہوا تھا؟؟۔

تو اُس کا یہ ایسے بدلنے والی نے واقعی اُسے زیر کر لیا تھا؟؟؟

مذاق مذاق میں۔ چھیڑ چھاڑ میں کیا وہ خود ہی اُس کا نشانہ بن گیا تھا؟

کیا اُس نے واقعی ہتھیار ڈال دیئے تھے اُس کے سامنے؟

کیا وہ پہلے ہی شکست کھا گیا تھا اُس سے؟

ہاں بھٹکوں سے لگا ہے وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔ ذہن و دل میں اب ایک کشمکش سی جاری تھی ہوئی تھی۔ مس فصیح نے رخ اچانک ہی اُس کی

طرف کرلیا۔

اور پھر

اُسے اپنی بیقراریوں کا واضح حل مل گیا۔ وہ اُسے ہی دیکھنے کو بیقرار تھا۔ تو اتنی ڈھیر ساری پشیمانی اُسے اسی لئے تھی۔ کہ وہ۔ وہ۔ نا وابستگی میں اُسے پسند کرنے لگا تھا۔

اس انوکھے سے جذبے سے آشنا ہوتے ہوتے وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ دل و دماغ کی چھڑی کئی دنوں کی جنگ اچانک ہی ختم ہو گئی۔ ذہنی کشمکش کو جیسے قرار آ گیا۔

پھر مس فصیح کی نظر اُس پر پڑی۔ ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں جانی پہچانی سی چمک لہرائی۔ مگر نظریں چار ہوتے ہی پلکیں گر گئیں۔ چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔ چند لمحے یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اچانک ہی مڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔ اُس کی لوفرانہ حرکتوں کے سامنے اُس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ سامنا نہ کر پائی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اندر گھس گئی تھی۔ چائے سے فارغ ہو کر وہ دیر تک باداموں کے دامن میں آلو کی کھیتی کی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ مگر پرنسس کے پاس نہیں گیا۔ جانے کیا ہو گیا تھا اُسے؟ وہ اس طرف چاہتے ہوئے بھی اتنا قریب نہ جا سکا۔ شاید عرصہ بعد وہ اپنے حواسوں میں آیا تھا۔ اور اُسے ایکبار پھر سے احساس ہوا تھا، کہ ان لوگوں کے اتنے قریب بلا اجازت یا بلا مقصد چلے جانا بعید از اخلاق ہے۔

وہ دوبارہ باہر نہیں آئی۔ اُس کی موجودگی سے خائف تھی یقیناً۔ دروازے کھلنے کی آہٹ پر اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ برآمدے میں نعیم چلا آ رہا تھا وہ فوراً ہی لمبے لمبے قدم اُٹھاتا اُس کی طرف بڑھا۔ جیسے کھینوں میں چہل قدمی کرنے پر بھی وہ نعیم کی نظروں میں مشکوک ہو جائیگا۔

پھر روز ہی ایسا ہوتا رہا۔ نعیم چار بجتے ہی ہوسٹل سدھار جاتا۔ وہ اکیلے ہی شام کی چائے پیتا۔ پھر باہر نکلتا۔ مگر زیادہ تر ساتھنے کی طرف۔ یا پھر اوپر ہی اوپر کچن کی طرف والی پہاڑی کے آخری ٹیرس پہ مرمریں کرسی پہ بیٹھ کر اطراف کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا۔ گو کہ دل یہی چاہتا تھا۔ کہ پچھلی طرف جائے۔ اُسے بھی دیکھے۔ مگر

روزانہ اُس طرف بیٹھنا یا گھومنا اُسے اچھا نہ لگا۔ کل بھی وہ پچھلی طرف سن روم کی طرف ٹہلتا ہوا گیا تھا۔ وہیں وہ اُسے ٹیرس پہ بیٹھی نظر آئی تھی۔" پھر اُسے دیکھتے ہی میز پر سے اپنی کتابیں سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

کپڑے بدلتے بدلتے وہ مسکراتے ہوئے اُسی کے متعلق سوچتا گیا۔ تیار ہو کر وہ باتھ روم کے راستے مرمریں ستونوں والے اندرونی برآمدے کے آخری سرے پہ نکل آیا۔ یونہی چلتا وہ سیب کے باغ والی پہاڑی کی طرف سیڑھیاں اُترنے لگا۔ پھر اچانک اُس کی نظر بائیں طرف ٹیرس پر پڑی۔ مس فصیح احمد اپنے کمرے کے دروازے میں سے سر باہر ڈال کر دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ شاید یہ دیکھنے کہ وہ موجود نہ ہو تو وہ باہر آ کر بیٹھے۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد اس نے پورا دروازہ کھولا۔ اور باہر آنے کے لئے قدم بڑھائے۔ مگر

جوں ہی اُسے آخری سیڑھی اُترتے سیب کی پہاڑی کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ اُلٹے قدموں اندر جا گھُسی۔

وہ بڑی دیر کی روکی اپنی ہنسی مزید نہ روک سکا۔ کھل کر ہنس دیا۔ آگے ہی آگے بڑھتا وہ سیب کے درختوں کے بیچوں بیچ چلتا سامنے کی طرف گیا۔ اور پھر مہمان خانے کی سیڑھیاں اُترتا نیچے آنے لگا۔

"پھر چہل قدمی ہو رہی ہے؟" نعیم نے سکوٹر گیٹ پر ہی روک کر اُس کی طرف بڑھتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "میں تو اس طرف پھر رہا ہوں"۔ وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو نہ پا سکا۔

"تو آؤ اس طرف پھریں"۔ اُسے ہاتھ سے پکڑتا وہ اسی طرف جانے۔۔

"نہیں یار۔ اچھا نہیں لگتا"۔ وہ واپس ہاتھ کھینچ کر پھر اُترنے لگا۔

اور نعیم ششدر سا کھڑا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دِنوں سے وہ کامران کی بدلی ہوئی حالت محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے اُس لڑکی سے چھیڑ چھاڑ اور پھر اُس چھیڑ چھاڑ کی تفصیل اُسے بالتفصیل بتانا بند کر دیا تھا۔

یا تو اُس لڑکی پر اُسے ترس آ گیا تھا۔ یا پھر تو وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن ۔ وہ تو کہتا تھا ایسا ممکن ہی نہیں۔

اُس کے پیچھے پیچھے چلتا وہ بھی اُس کے بیڈروم میں داخل ہو گیا۔

"آج میرے پیچھے کیا کیا ہوا؟ میرا مطلب ہے میں تمھیں دو ڈھائی گھنٹے مُرز دیتا ہوں"۔ صوفے پر اُس کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے نعیم پھر گویا ہوا۔

"کچھ نہیں ہوا"۔

" یار! تم بگڑے بدلے سے نظر آتے ہو۔ نہ وہ غل نہ وہ غبار۔"
"کام زیادہ ہوتا ہے آجکل۔ غل غپاڑے کا وقت نہیں ملتا۔"
" تو تم شام کو میرے چلے جانے کے بعد آفس کا کام کرتے رہتے ہو؟" ایک مبہم سے خیال کو تقویت مل رہی تھی۔
" نہیں۔ نہیں تو۔" وہ پاس پڑا رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔
" پھر؟ ملے نہیں اُس سے؟" نعیم بھی پوری تفتیش پر تلا نظر آرہا تھا۔
" بھئی کس سے؟" رسالہ رکھ کر وہ مصنوعی جھنجھلاہٹ سے بولا۔ وہ جوامی موضوع کو کسی طرح چھوڑتا نہیں تھا۔
" اپنی پڑوسن سے۔"
" وہ کون ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
اور نعیم نے اُس کے زور سے کہنی ماری۔
"مس فصیح احمد۔"
" اوہ۔ اچھا۔۔۔" اُس نے ہنستے ہوئے گویا لاپرواہی سے کہا۔
" مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔"
" وہ کالا نکال کر پھینک دو۔ دال صاف ہو جائے گی۔"
" لیکن تم صاف نہیں لگ رہے۔"
" بھئی پلیز! اب ختم کرو یہ Topic۔ کوئی اور بات کرو۔ کچھ اپنی پروگریس بتاؤ۔ پاس ہوتا ہے اس سال یا ابھی نہیں؟"
" میری بات چھوڑو۔ اپنی سناؤ۔ بی۔ اے کلیئر کرنا ہے۔ اس سال یا نہیں؟"

اور کامران زور سے قہقہہ لگا اٹھا۔

"وہ دیکھو مس فصیح احمد باہر نکلی ہیں" ڈریسنگ روم کے کھلے دروازے سے ڈریسنگ روم کی کھڑکی میں سے اس کی ایک جھلک واقعی نعیم نے دیکھ لی تھی۔

"تو میں کیا کروں" وہ بدستور اپنی سامنے پھیلائی ٹانگوں کو تکتے ہوئے بولا

"کامران" نعیم نے اپنی پانچوں انگلیاں اس کے آگے نچائیں "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ واقعی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

یا تو کامران نے مذاق چھوڑ چھاڑ دیا تھا۔ اور اب اس کے متعلق مزید کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔ یا پھر شاید اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اسے کچھ شک ضرور پڑ گیا۔ مگر منہ سے بولا نہیں۔ "کچھ نہیں" کامران مسکراتے ہوئے بولا۔ اور جھک کر اپنے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

نعیم زیر لب مسکرایا۔ دال میں ضرور کالا تھا۔ لیکن اس نے موضوع بدل دیا۔ وہ منتظر تھا کہ کب کامران خود اسے بتاتا ہے سب۔

۱۵

موسم بھیگا بھیگا تھا۔ سیاہ بادل پورے آکاش کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ سردی اچانک ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس آرام کرسی پہ نیم دراز تھی۔

ہاتھ میں کاپی تھامے وہ بائرن کی حالاتِ زندگی پر لکھے نوٹس پر سرسری نظریں ڈالتی صوفیہ کی منتظر تھی۔

باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس لئے آج اس نے اُسے لینے کے لئے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔ کل سے وہ اُس کے پاس آکر اکٹھا پڑھ لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ تھوڑی دیر میں پہنچنے والی تھی۔

تیز بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹین کی چھت پر پڑ پڑ کر شور مچانے لگیں۔ تو وہ چونکی۔ کاپی سامنے کی میز پر رکھی۔ اور اُٹھ کر چوڑی کھڑکی کے پردے کھسکاتے ہوئے بند شیشوں کے اُس پار دیکھنے لگی۔ زور کی بارش سے پانی کی چادر سی تن گئی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ برآمدے کے مرمریں ستون سے ٹیک لگائے وہ دور ندی کی طرف نظریں جمائے کھڑا تھا۔

اُس دن کے بعد سے جانے کیا بات تھی؟ وہ اپنے برآمدے میں — دور یا بڑے ہام کے باغ کی طرف۔ اپنے سن روم کے پاس یا کبھی کبھار جیب کے باغ کی طرف چلتا اُسے دکھائی دیتا۔ اُس نے ٹیرس کے رخ پر ایک بار بھی قدم نہیں بڑھایا تھا۔ بلکہ وہ تو اب اس طرف ایک آدھ غیر ارادی نگاہ کے علاوہ دیکھتا ہی نہیں تھا۔ کیا ہو گیا تھا اُسے؟ —

اچانک ہی اپنی ہر اوٹ پٹانگ حرکت چھوڑ دی تھی۔ بڑا سوبر سا نظر آتا تھا۔ آجکل۔ جیسے پچھلی اُچھل کود سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو اس کا۔

چند ایکبار اُسے ٹیرس پر بیٹھے دیکھا بھی تھا۔ مگر دور ہی سے مسکراتا اپنی

راہ ہو لیا تھا ۔ نہ پاس آیا تھا ۔ نہ کوئی فضول حرکت کی تھی ، نہ گھورا تھا ۔ نہ تاکا تھا ۔
یہ اچانک
اتنی زبردست تبدیلی ؟ ۔
اس نے دیکھا اس وقت بھی ::: برستی بارش کے اس پار دور ندی کی
پانیوں میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا ؟
سیاہ رنگ کا گرم سوٹ پہنے سوچوں میں ڈوبا وہ خاصا بردبار نظر آ رہا
تھا ۔ PERSONALITY میں تو تھا ہی یکتا ۔ " تو یہ بات ہے ؟ " جانے کب سے
صوفیہ پاس کھڑی اس کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھی ۔
اور وہ ہڑبڑا کر کھڑکی سے پرے ہٹ آئی ۔
" کس وقت آئیں ؟ "
" تمہیں کیوں بتاؤں " ۔ وہ بھی وہیں کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی ۔
" نہ بتاؤ " ۔ شانی پھر آرم چیئر پہ بیٹھ گئی ۔
" اچھا بتاؤ کیا ہو رہا تھا ؟ "
" تمہارے خیال میں اتنے فلصلے سے اور پھر اتنی بارش میں کیا ہو سکتا تھا ؟ " ۔
وہ صوفیہ کو چھیڑتے ہوئے بولی ۔
" تم نے نہیں اس نے ضرور کچھ کیا ہوگا " ۔
" جانے کیا ہوا ہے اسے ؟ اب تو بالکل خاموش رہنے لگا ہے " وہ سنجیدگی
سے بولی ۔
" اور تمہیں فکر لاحق ہو گئی ہے ۔ کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا ہے " ۔

"نہیں ہوگئی ہوگی نا فکر لاحق"۔ وہ خواہ مخواہ بلش ہوگئی۔

"ویسے بُرا وہ تب بھی نہیں لگتا تھا"۔ صوفیہ پھر سفارش کرنے لگی۔

"یہی تو بات ہے کہ وہ بُرا نہیں لگتا۔"

"سچ؟"۔

"میں نے ایک حقیقت کہی ہے"۔ وہ پھر بلش ہوگئی۔

"اور حقیقت کہتے کہتے تم بلش بھی ہو رہی ہو"۔

"بس کرو صوفیہ تمہیں بھی سوائے اس کے اور کوئی بات ہی نہیں سوجھتی"

"ویسے تمہاری نوجوان چھوٹ گئی نا"

"ہاں یہ تو ہے"۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اب واقعی کچھ نہیں کرنا ہے"۔

"اول ہوں ہوں"۔

"لیکن تم اب بھی باہر نہیں نکلتیں"۔

"مجھے اب بھی ڈر لگتا ہے اُس سے۔ پتہ نہیں کیوں؟"۔ وہ خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ثنائی! کہیں اس ڈر ڈر میں تم اُسے۔۔۔"، وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"نہیں اور۔ بالکل نہیں۔ تم ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ آؤ پڑھیں"۔ اُس نے اُسے زبردستی کتاب پکڑاتے ہوئے بٹھا دیا۔

"تم نے باقی تو اُسے ہر لحاظ سے معاف کر دیا ہے۔ کیا اس کا بیاہ ایسے میں

فیل ہونا قابلِ معافی نہیں سمجھو گی؟" صوفیہ پڑھتے پڑھتے بیچ میں بول اٹھی
"نہیں۔ یہ ناممکن ہے"۔
"کیوں مگر؟"
"نہیں پتہ تو ہے"
اور صوفیہ پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔
"جب سے اُس نے تمہیں تنگ کرنا چھوڑ دیا ہے تم اس سے متاثر نظر آ رہی ہو"
"ہوں متاثر پھر؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔
"تو پھر اس کا فیل ہونا بھی معاف کر دو"
"ایسا نہیں ہو سکتا"
"اس کا مطلب ہے وہ فیل نہ ہوا ہوتا تو تم اس وقت یقیناً اُسے پسند کرتیں"
"شاید"۔ وہ شرارت سے بولی۔ "شاید نہیں یقیناً"۔
"غالباً"۔ وہ مزید شوخی سے بولی۔
"شائی! تم زبان سے اقرار نہ کرو وہ اور بات ہے۔ تمہاری آنکھیں تمہارا چہرہ سب اُس کے حق میں بول رہے ہیں"۔ وہ کتاب چہرے کے آگے کیے شائی کی سامنے والی کرسی پر بیٹھی پھر بول پڑی۔
اور شائی نے اُسے کوئی جواب دیئے بنا کال بیل پر انگلی دبا دی۔
"ماما کو چاہیے کہ ہمیں گرم گرم شامی کباب اور ایک ایک کپ کوفی دے جائیں"
"ایک پیالی پیچھے برآمدے میں بھی بھجوا دو۔ بیچارا سردی میں ٹھٹھر رہا ہو گا"

"تمھیں وہاں نہ بھجوا دوں اُٹھا کر؟" ثنائی جھنجھلا کر بولی۔
"میں تمھیں اُٹھا کر وہاں ڈال آؤں گی۔ یقیناً زیادہ خوش ہو گا"
"اب شاید اُسے زیادہ خوشی نہیں ہو گی"۔
"کیوں؟ اب کیا ہوا؟"۔
"اب وہ اس طرف دیکھتا ہی نہیں"۔ اُس نے معصومیت سے کہا۔
"اوہ! تو تمھیں واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ وہ اب اس طرف نہیں دیکھتا"۔
"نہیں صوفیہ! میرا یہ مطلب نہیں تھا"۔ وہ سٹپٹاتے ہوئے بولی۔
"کوئی بات نہیں میں اُسے کہہ دوں گی۔ کہ وہ اس طرف ضرور دیکھے"
"میں نے شکر کیا ہے کہ وہ اس طرف نہیں دیکھتا"
"کیوں؟"
"بس! مجھے ڈر لگتا ہے اُس سے"۔ وہ بے بس سی بولی۔
اور صوفیہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر اُٹھ کر دوبارہ کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔
"تو یہ ٹھاٹھ ہیں"۔ وہ زیرِ لب بولی۔
اور ثنائی نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔
اس کا نوکر اوورکوٹ ہاتھوں میں لیے اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اور وہ بے نیازی سے ہاتھ کوٹ کی آستین میں ڈالتا ہنوز سامنے دیکھ رہا تھا۔
"اب تو نوکر بھی نظر آنے لگے ہیں"۔ ثنائی دھیرے سے بولی۔
"دیکھ لیا تم نے۔ کیا شانِ بے نیازی ہے"۔ صوفیہ ابھی ابھی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ "نوکر کیا پہلے نہیں ہوتے تھے؟"۔

"یقین کرو صوفیہ! ایک بھی نوکر نظر نہیں آتا تھا۔ جن دنوں یہ اودھم مچائے رکھتا تھا۔ ہر طرف خاموشی سی رہتی تھی۔ اب ہر طرف نوکر چاکر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے نوکروں کو مخل ہونے سے منع کیا ہوگا؟" صوفیہ اب بھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ "ظاہر ہے بھوت من مانی کس طرح کرتا ان کے سامنے"۔ اس نے مزید کہا۔

ثانی پھر کتاب پر جھک گئی تھی۔ صوفیہ اسے سنجیدہ دیکھ کر کھڑکی سے ہٹ آئی۔ اور اسکی دیکھا دیکھی وہ بھی سنجیدگی سے پڑھنے لگی۔

١٦

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ نعیم حسب معمول ہوسٹل جا چکا تھا۔ کامران تیار ہو کر باہر آیا۔ ایک کپ چائے برآمدے میں پی۔ اور تنہائی سے اکتاتا ہوا بادام کے باغ والی پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا سن روم کے پاس سے گھومتا سامنے آیا۔ اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ندی میں اتر گیا۔

تھوڑی دیر اطراف کو تکتا وہ ندی کے کنارے آگے بڑھنے لگا۔

موسم بے حد حسین ہو رہا تھا۔ بادل آج بھی پورے آسمان کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور ندی کا پانی مخصوص شور کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کنارے کنارے چلتا کوٹھی سے کافی دور نکل آیا۔

یہاں دائیں طرف دبی سرمئی پہاڑ اور ندی۔ اور بائیں طرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ہری ہری فصل اُگی نظر آرہی تھی۔
مگر یہ پیچھے کی طرف ہاتھ باندھے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہی گیا۔ پھر اُسے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ شام ملگجی ہونے لگی۔ تو
اُس نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ آسمان پر نگاہ کی۔ پرندے تیزی سے اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھے۔ ہوا مزید یخ بستہ ہو گئی تھی۔ بادل اور بھی بڑھ گئے تھے۔ اور ندی کا پانی مزید چمکنے لگا تھا۔
وہ پھر اُسی کنارے پر چلتا ہوا واپس آنے لگا۔ تھوڑے فاصلے پر ہی تھا کہ سامنے ندی میں سنگ مرمر کے چبوترے پر نظر پڑی۔ اُس کی طرف رخ کئے مس قیصر احمد اردگرد سے بے نیاز کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو وہ جھجک کر رکا۔ چبوترہ پہاڑی اور کوٹھوں سے گھرا بہت تنگ سی جگہ میں واقع تھا۔ وہ تنہا بھی تھی۔ اُسے آگے جانا مناسب نہ لگا۔ مگر
پھر جانے کون سا جذبہ تھا؟ جو اُسے آگے بڑھنے پر مجبور کرنے لگا۔
اُس نے دنوں بعد اُسے دیکھا تھا۔ تنہائیوں میں شدت سے چاہا تھا کہ اُسے دیکھے۔ ملے۔ باتیں کرے۔ مگر اوّل تو اُس کی طرف بلا مقصد چلے جانا اُسے مناسب نہیں لگتا تھا۔ اور پھر وہ کہیں نظر آ بھی جاتی تھی، تو اُسے دیکھتے ہی اندر گھس جاتی تھی۔
وہ چاہتا تھا کہ اُسے دیکھے نزدیک سے۔ باتیں کرے اُس سے ڈھیر ساری فطری تقاضا تھا یہ۔ مگر موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ ایسا کرنے کا۔
دلنشیں مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے وہ خراماں خراماں آگے بڑھنے لگا۔

اور تبھی شانی چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ شام کے گہرے ہوتے سایوں میں بھی وہ اُسے بخوبی پہچان سکتی تھی۔

لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ مخصوص چال۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا وہ قریب آتا گیا۔ اور

شانی جانے کیوں؟ سفید پڑتی گئی۔ شام اندھیری ہو رہی تھی۔ اور وہ بالکل تنہا تھی۔ بہت دنوں بعد۔ بہت بڑا مذاق بھی تو ہو سکتا تھا۔ اُسے دیکھتے دیکھتے وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ پھر کامران نے دیکھا۔ وہ ایک ہی قدم اور پیچھے ہٹتی تو پانی میں جا گرتی۔ اُس نے واقعی قدم پیچھے ہٹایا۔ اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔

کامران لپک کر آگے بڑھا۔ اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اُسے اپنی طرف کھینچا۔ اور ساتھ ہی اُس کی بلند ہونے والی چیخ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دی۔

یہ سب اتنا غیر متوقع ہوا۔ کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا کہ اسکی آمد پر وہ اس قدر گھبرا جائیگی۔ تو وہ کبھی وہاں نہ آتا۔

کسی نے اُس کی چیخ سُن لی ہوتی تو؟

نوکر چاکر آجاتے اور اُسے شام کے اندھیرے میں اس تنگ سی جگہ میں اُس کے ساتھ دیکھ لیتے تو؟ دونوں کی کیا پوزیشن ہوتی؟ ایک ذمہ دار اور اہم پوسٹ پر فائز تھا وہ۔ چھوٹا سا علاقہ تھا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ سکتی تھی۔

"پلیز شانی! گھبرا کیوں رہی ہو؟ آؤ میں تمہیں اوپر چھوڑ آؤں"۔ اسی طرح اسکی کمر میں ہاتھ ڈالے سہارا دیتے ہوئے وہ اسکی سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے نرمی سے بولا "آپ۔۔۔ آپ؟" وہ اب بھی سہمی جا رہی تھی۔ "تم اتنا گھبرا کیوں ہو

مجھے دیکھ کر۔ . . ” وہ آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتا اپنا بیت سے کہتا گیا ۔
شانی زم بخیدوسی اُس کے سہارے اُوپر چڑھتی گئی ۔

” میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا تھا۔ چھیڑتا تھا تمہیں ۔تم نے اُسے اتنا سیریس لے لیا ہے“۔ وہ دھیرے سے مسکرایا ۔” معاف کردو اب ۔ آئندہ اس طرح نہیں ہوگا ۔ ٹھیک ہے نا؟“۔ وہ اسکی حیرت سے کھلی آنکھوں میں تکتے ہوئے بولا ۔

وہ خاموش رہی ۔ اُسے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی ۔ کتنا تضاد تھا ۔ پہلے کے اُس آدمی میں اور

اب کے اِس آدمی میں ۔

” معاف کردیا نا؟“۔ آج وہ پہلی بار اُن کے ٹیرس پر آیا تھا ۔

ٹیوب لائیٹ کی دودھیا روشنی میں اُس نے دیکھا ۔

نازک سی کانچ ایسے بدن والی لڑکی کی نظریں جھکی جا رہی تھیں ۔

کچھ اُس کی قربت کا اثر تھا شاید ۔ کچھ اُسکی آنکھوں میں ڈولتی اُن کہی کہانیوں کا ۔ اُس کی پلکیں جھکتی ہی چلی گئیں ۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا ۔

” معاف نہیں کردگی ؟“۔ اُس کے چہرے پر گھر آئی بالوں کی لٹ آہستہ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اُس نے پھر کہا ۔

” آپ . . . آپ . . . . ؟“۔ اُس نے ایک پل کو جھکی پلکیں اُٹھائیں ۔

جانے کیا کہنا چاہتی تھی وہ ؟ اُس کی بولتی نظروں سے نظریں ملتے ہی اُس کی پلکیں پھر گرنے اُٹھنے لگیں ۔

"بہت تنگ کیا تھا میں نے؟"۔ ریلنگ پر رکھے اُس کے یخ بستہ نازک سے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

کوئی جواب دیئے بنا اُس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ لیا۔

وہ پھر مسکرا دیا۔

"معافی کے قابل نہیں ہوں؟"۔ اُس نے مزید پوچھا۔

اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی بات پر مسکرا دی۔

"دیکھو میں ہاتھ جوڑ رہا ہوں"۔ اُس نے جھکی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ DASHING PERSONALITY والا دونوں ہاتھ جوڑے معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔

"چلو پہلے سوچ لو۔ پھر معاف کر دو"۔ وہ اُسکی پلکیں جھپکاتی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے خوبصورتی سے ہنس کر بولا۔

جبکہ اُسے یقین تھا۔ وہ مزید ناراض نہیں رہی تھی۔ "سردی بڑھ رہی ہے تم اندر جاؤ۔ میں چلتا ہوں اب"۔ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ ریلنگ تک آیا۔

وہ اب بھی گم صم سی وہیں کھڑی رہی۔

"شب بخیر"۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

اور آرام سے ریلنگ پھلانگ کر اپنی کوٹھی کے احاطے میں اُتر گیا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

"کل کے اُس آدمی میں اور آج کے اِس آدمی میں کتنا تضاد تھا؟
آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ واضح طور پر بہت کچھ کہہ رہا تھا DAS HING
RESPONALITY والے - کی باتیں بھی بڑی DASHING
تھیں۔"

"میں نے تمھارے ساتھ مذاق کیا تھا" خوبصورت ٹیبل لیمپ سے لگی کھڑی
وہ دیر تک سوچتی رہی ۔

۱۷

خوبصورت انگریزی دُھن منہ ہی منہ میں گنگناتا اُس نے زور سے
اپنے بیڈروم کا دروازہ کھولا ۔

"خیریت؟" کونے میں رکھی اُس کی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے نعیم بیٹھا
خط لکھتے لکھتے رُخ موڑے بغیر گویا ہُوا ۔

اور وہ ٹھٹھک کر رہ گیا ۔ دھن یکلخت ہی تھم گئی ۔ جیسے بدمست سی دھن سن
کر بھی نعیم نے اس کی چوری پکڑ لی ہو ۔

وہ آہستہ قدم چلتا نعیم کے قریب آگیا ۔

"میں نے خیریت پوچھی ہے حضور کی؟" ۔ اُس نے فوراً اپنے لکھے ہوئے
خط پر کتاب رکھ دی ۔

"ٹھیک ہوں" ۔ وہ اپنے کوٹ کے کالر سے کھیلتے ہوئے دھیرے سے بولا ۔

"آواز سے تو بخار معلوم ہو رہا ہے"۔ وہ اب بھی خط پر جھکا بیٹھا تھا۔
کامران وہاں سے چل کر کھڑکی تک آیا۔ بلا مقصد پہلے سے برابر کئے گئے
پردے دوبارہ برابر کرنے لگا۔
چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر رخ پھیر کر نعیم کو دیکھنے لگا۔ وہ اب بھی تیزی
سے خط لکھنے میں مصروف تھا۔ کامران کچھ بے چین سا نظر آنے لگا۔
وہ چاہتا تھا نعیم کو سب بتا دے۔ چند دنوں سے جو وہ ایک میٹھی میٹھی سی
کسک اپنے پہلو میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا۔ اس
کی تفصیل اُسے بتا دے۔ اُسے کہہ دے کہ جو پیشن گوئی اس نے کی تھی۔ وہ حرف بہ
حرف صحیح نکلی ہے۔ اس نے آج تک کوئی بات اُس سے نہیں چھپائی تھی پھر
اتنی بڑی بات۔ اتنا اہم انکشاف!
وہ کم از کم نعیم سے نہیں چھپا سکتا تھا۔ مگر
اُسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ ادھر جانے کیوں؟ اتنے بلند بانگ دعوؤں
کے بعد اُسکی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے سامنے اقرار کرنے کی
دو قدم چل کر وہ پھر اس کے قریب چلا آیا۔
"کچھ UN EASY سے لگ رہے ہو" نعیم مزید تیزی سے خط لکھتے
ہوئے بولا۔
"ہوں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔"
"بھئی TAKE IT EASY - ایسا ہوتا ہی ہے"۔ نہ وہ خط سے
سر اٹھا رہا تھا۔ نہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

وہ جھنجھلا سا اُٹھا ۔

"مجھے وہ لڑکی اچھی لگنے لگی ہے"۔ بڑا سا فائل اُٹھا کر اُس کے خط پر رکھتے ہوئے وہ بلا تمہید بول اُٹھا ۔

"کیا؟"۔ پہلے سے شک سا ہونے کے باوجود وہ اس وقت یوں اُچھل پڑا ۔ جیسے اچانک ہی کسی نے پاؤں کے نیچے سے قالین کھینچ لیا ہو ۔

"ہاں"۔ اُس نے خوبصورت پلکوں کو اثبات میں جنبش دی ۔

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی ۔ مدھم سی خفیف سی ۔ اور کچھ اتنے دھماکہ خیز انکشاف کے بعد ۔ نادم سی بھی ۔

"ارے"۔ نعیم سب چھوڑ چھاڑ کھڑے ہو کر اُس سے یوں بغل گیر ہوا ۔ جیسے دونوں نے کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ فتح کر لیا ہو ۔ پھر اُس نے خط نہیں لکھا ۔

"یہ سب ہوا کیسے؟"۔ نعیم اُسے ہاتھ سے پکڑ کر قریبی صوفے پر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا ۔

"بس ہو گیا"۔

"پھر بھی؟"۔

"بھئی ہو گیا نا"۔

"کیا ہو گیا؟"۔ "اس سے پیار ہو گیا"۔

"یعنی اچھی لگنے کے بعد اب پیار بھی ہو گیا؟"۔

"عشق ہو گیا ہے عشق"۔ وہ مزید شوخی سے بولا ۔

"اچھا تو یار! یہ چکر چلا کیسے؟"۔

"بس چل گیا"۔

"پھر بھی بتاؤ نا"۔

"بس مجھے خود پتہ نہیں چلا۔ کہ کیسے ہوا یہ سب۔ ویسے وہ بے حد نازک ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔ یہ تو سب میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ان باتوں کا شاید مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں اُسے چھیڑتا تھا۔ وہ مشتعل ہو جاتی تھی۔ چڑاتا تھا۔ وہ چڑ جاتی تھی۔ تب تو مجھے دلی سکون ملتا تھا۔ پھر۔

چھیڑ چھاڑ حد سے بڑھ گئی۔ وہ مجھے بُرا بھلا کہہ کر تھک گئی۔ لاجواب سی ہو گئی۔ پھر بجائے مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے۔ بُرا بھلا کہنے کے خاموش رہنے لگی۔ اس پر بھی بس نہ ہوا۔ مذاق۔ چھیڑ چھاڑ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا۔ تو وہ بے بس سی ہو گئی۔

جب بھی میری کسی احمقانہ حرکت کا جواب نہ بن پڑتا۔ تو رونے لگ گئی۔" وہ آہستہ آہستہ کہتا گیا۔ پھر دھیرے سے ہنس دیا۔" نہیں شاید وہ مجھے۔۔۔۔"

"تمہیں مات دے گئی"۔

"ہاں"۔ اُس نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے اقرار کیا۔

"پھر وہ مجھ سے خائف رہنے لگی۔ اپنے دروازے سے باہر نکلتے وقت اِدھر اُدھر دیکھ کر نکلتی۔ یا پھر مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر اندر چلی جاتی۔ اور یوں۔۔۔۔۔"

"تمہارا جذبۂ شوق بڑھتا گیا"۔

"ہاں۔ بلکہ جب میں اچھی طرح سوچتا ہوں تو وہ مجھے آخری چھیڑ چھاڑ میں ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ یہ اور بات تھی۔ کہ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یا یوں سمجھو کہ سمجھنے سے کترا رہا تھا۔ مگر اب سوچتا ہوں تو وہ مجھے وہیں سے اچھی لگنے لگی تھی"۔

"کیوں؟" نعیم اچانک بولا۔

"اچھی چیز اچھی لگتی ہی ہے"۔

"اور وہ تمہاری WILL POWER؟"

اور کامران نے جاندار قہقہہ لگالیا۔

"سب ختم"۔ اُس نے تھکے سے انداز میں کہتے ہوئے ٹانگیں نعیم کی گود میں پھیلاتے ہوئے سر صوفے کے بازو پر ٹکادیا۔

"کچھ اُسے بھی پتہ چلا ہے؟"۔

"کس بات کا؟"

"تمہارے عاشق ہونے کا"۔

"میں نے اُس سے اپنی پچھلی حرکتوں کی معافی مانگ لی"۔

"کب؟"۔

"ابھی ابھی؟"۔

"بڑے موقعہ شناس ہو مجھے ہوسٹل بھجوا کر خود گلچھرے اڑاتے ہو"۔

"اتنے دنوں بعد آج تو ملی ہے"۔

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟"۔

"بتانے والی نہیں ہیں۔" وہ کروٹ کے بل لیٹتے ہوئے آنکھیں بازو سے ڈھانپ کر شرارت سے بولا۔

"تو یہ بات ہے؟"۔

"ہاں"۔

اور نعیم نے جھنجھلا کر اس کی ٹانگیں پرے ہٹا دیں۔ ساتھ ہی وہ لڑھکتا ہوا قالین پر جا گرا۔

"اب بھی نہیں بتاؤں گا۔" وہ وہیں پڑے پڑے ہنستے ہوئے بولا۔

"نہ بتاؤ"۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا خاصا موڈ تھا خط لکھنے کا۔ آ گئے لے کر ردّی صورت"۔

اور کامران پھر سے ہنسنے لگا۔

نعیم جھنجھلایا سا دوبارہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ کامران اُٹھ کر پھر اس کے قریب چلا آیا۔

"ابھی تک خوشبو آ رہی ہے"۔ ... اپنا ہاتھ سونگھتے ہوئے جیسے نعیم کو چڑانے کو بولا۔

"کس چیز کی؟" وہ پھر اس کی باتوں میں آ گیا۔

"اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"لونڈر کہیں کے"۔

اور کامران کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاتھ کیا سنبیٹ کی شیشی تھی؟" وہ دوبارہ خط پر نظریں دوڑاتے

ہوئے بولا۔

"وہ سرتاپا خوشبو ہے"۔

"بس بس سن لیا۔ اب خط لکھنے دے"۔ وہ روز بلا ناغہ ایک خط سبینہ کو روانہ کرتا تھا۔ اسی رفتار سے وہاں سے بھی جواب آتا تھا

"کیا لکھتے رہتے ہو روز؟"

"یہ بھی تجربہ ہو جائے گا۔ جاؤ اب"۔

اور کامران نے مزید مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی"۔ وہ ڈریسنگ روم کی طرف چلتے چلتے بولا۔

"امی سے کہہ کر فوراً اُسے بیشتر لے اڑوں گا"۔

"یعنی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ"۔ وہ سر جھکائے خط لکھنے میں مصروف تھا۔

"ہاں۔ میں تاخیر کا قائل نہیں"۔ وہ مزید شوخی سے بولا۔

"WILLPOWER ہونی چاہئیے"۔ نعیم نے کہا۔

اور کامران قہقہوں پر قہقہے لگاتا ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

۱۸

مقامی سینما میں MAYERLING لگی تھی۔ ایک عرصہ بعد ایک شاہکار فلم۔

صوفیہ کے ساتھ اس نے کالج میں ہی پروگرام بنا لیا۔

"یہ لیکچر مس نہیں ہونی چاہیئے ، پھر جانے اتنی اچھی لیکچرار آئے ۔ نہ آئے ۔"

" اور ٹسٹ کی تیاری؟" صوفیہ نے کہا تھا ۔

" بھئی فریش ہو کر ہی اچھی تیاری ہو سکے گی نا" ۔ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا ۔

اور پھر کالج سے آتے ہی فون کر کے اُس نے دو سیٹیں ریزرو کروا لیں ۔ کھانا کھا کر وہ جانے کے لئے تیار ہونے لگی ۔ نیوی بلو رنگ کا گرم سوٹ پہن کر اُس نے نرم نرم قیمتی فر کا سفید کوٹ پہنا ۔ بالوں کو پن اپ کرتے ہوئے سفید فر کی سمارٹ سی ٹوپی پہنی ۔ نیوی بلو سوکس پہن کر اونچی ایڑی کی خوبصورت سفید جوتی پہنی لباس پر اپنے مخصوص خوشبو کی سپرے کرتے ہوئے وہ ماما کے ہمراہ باہر نکلی ۔

ڈرائیور نے اُسے دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول دیا ۔ اور ماما کو خدا حافظ کہہ کر کچھ آگے چل کر اُس نے صوفیہ کو بھی گھر سے لیا ۔ اور ٹھیک وقت پر سینما پہنچی ۔

گیلری میں گیٹ کیپر کی رہنمائی میں صوفیہ آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے چلتی سب سے اوپر کی قطاریں پہنچ گئیں ۔ پھر اُس کی نشاندھی پر کونے کے ایک نرم آرام دہ صوفے پر یکے بعد دیگرے بیٹھ گئیں ۔

اُس نے گیلری میں ایک سرسری نظر ڈالی ۔ رش زیادہ نہیں تھی ۔ چیدہ چیدہ لوگ آئے بیٹھے تھے ۔ علاقہ عقوٹا سا تھا ۔ چند ہی لوگ ایسے تھے ۔ جو ایسی لیکچر کی قدر جانتے تھے ۔ عام طبقہ وہی انگلش لیکچر پسند کرتا تھا ۔ جس میں شور شرابا ہو ۔ کاؤ بوائز قسم کی ایکشن ہو ۔

بہرحال نیچے تھرڈ کلاس اب بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی
اُس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ دو چار منٹ اب بھی رہ
ہونے میں۔

" اسے شائی! شہزادہ بھی آیا ہے"
"میرا کون؟" وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔
"اپنے دائیں طرف دیکھ"
اور شائی نے اطمینان سے رُخ دائیں طرف کر لیا۔
اس کے قریبی صوفے پر وہ بیٹھا تھا۔
"ہیلو" اُسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ دھیرے سے بولا۔
"ہیلو"۔ اُسے بھی کہنا پڑا۔

دیکھا۔ اُس کا رنگ پھر بدل گیا تھا۔ وہ کچھ بے چین سی نظر آنے لگی تھی پھر وہ رخ پھیر کر اپنی ساتھی سے کچھ کہنے لگی تھی۔ اس کی ساتھی نے جواب میں سامنے کی خالی سیٹس (seats) کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور پھر وہ اُس کا ارادہ بھانپ گیا۔

"پلیز!" سیٹ کے بازو پر رکھے اُس کے ہاتھ پر اُس نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" اُس کے چہرے پہ تاریک سائے اور لہجے میں تحکم سا تھا۔

جانے کیوں؟" وہ مرعوب سی نظر آنے لگی۔ اُس شام سے جب وہ اسے پیرس پر لایا تھا۔ وہ اُسے یکدم ہی بہت بڑا۔ سوبر سا۔ بُردبار سا لگنے لگا تھا۔

"کچھ نہیں" وہ معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

اور اس کی سہمی سی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ خوبصورتی سے مسکرا دیا۔ وہ بالکل یوں بولی تھی، جیسے تین سال کا معصوم بچہ کسی بڑے سے سہم کر جھوٹ بول دے۔

"جھوٹ نہیں بولا کرتے" ۔ وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر مضبوطی سے دھرا تھا۔

شانی کی پلکیں جھک گئیں۔ جانے کیا ہوا تھا؟ اُس شام بھی وہ اُس کے سامنے کچھ بول نہیں سکی تھی۔ وہ حال اب بھی تھا۔ وہ اچانک ہی اپنے آپ کو اُس کے سامنے بالکل چھوٹا سا محسوس کرنے لگی تھی۔ جیسے وہ بہت بڑا ہو اُس سے۔ ویسے اِس بات پر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ضرور پھیل گئی۔

"آگے نہیں جاؤ گی مجھیں"۔ اُس نے مزید کہا۔

وہ اب بھی خاموش رہی۔ ہاتھ البتہ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنے کو کھینچا۔ مگر اُس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اُس نے گھبرا کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے دیکھ رہی تھی، تو وہ سمجھ رہی تھی سب؟ اس نے ڈرتے ڈرتے کامران کے اُس طرف بیٹھے نعیم کو دیکھا۔ ٹانگ پر ٹانگ دھرے وہ بے نیازی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

وہ پریشان سی بیٹھی رہی۔ پھر ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ مزید گھبرا گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ کم از کم اندھیرے میں وہ اس کے اس قدر قریب نہ بیٹھ سکے گی۔ اُس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ کھینچا۔ پھر اُس نے محسوس کیا وہ ہنس رہا تھا۔

"میں یہاں نہیں بیٹھوں گی"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"کیوں؟"۔ وہ بھی سرگوشی میں پوچھنے لگا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں"۔ مگر

بجائے ہاتھ چھوڑنے کے اُس نے نہایت اطمینان سے اپنی پانچوں انگلیاں اُس کی نازک سی انگلیوں میں پھنسا لیں۔

"پلیز!" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اور کامران کو لگا۔ وہ ابھی رو دے گی۔

"میں ہاتھ چھوڑ دوں گا مگر یہاں سے اُٹھنا نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ اُس نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مگر اب کے اس کی گرفت اُس کی کلائی پر تھی۔

"اوہ"۔ اور ساتھ ہی وہ دوسرے ہاتھ سے اُس کا ہاتھ ہٹانے لگی۔

اُسکی ہنسی وہ صاف سن رہی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں"۔ ساتھ ہی اُس کی آواز رُندھ گئی۔

"اوہ" اُس نے ہڑبڑا کر اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "آئی ایم سوری"۔ وہ جلدی سے بولا۔

پھر سمٹ کر نعیم کے قریب ہو گیا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے نہیں اُٹھی پھر۔ دونوں کے درمیان اب کافی فاصلہ حائل تھا۔ وہ بظاہر تحریر دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ مزہ نہیں رہا تھا جو ہال میں آنے سے قبل اُسے متوقع تھا۔ کامران اور نعیم اللہ خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

پھر بریک ہوئی۔ ہال میں روشنی ہو گئی۔ کامران نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی سفید روئی کے گالوں کی طرح نرم کوٹ اور ہمرنگ ٹوپی میں وہ بہت پیاری اور معصوم لگ رہی تھی۔ چھوٹی سی۔ گڑیا سی۔ جانے کیا تھا؟ وہ جب بھی اُسے دیکھتا وہ اُسے بہت چھوٹی سی لگتی۔ بالکل جیسے چند سال کی معصوم سی بچی ہو۔ تھی بھی کتنی نازک سی۔ ذرا سی بات پر رو پڑتی تھی۔

اس کی ساتھی اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ بھی مسکرائے جا رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے دائیں طرف دیکھا تھا۔ اور وہ سامنے دیکھتے ہوئے خوبصورتی سے مسکرا دیا تھا۔ کتنی گھبرائی تھی۔ اس کی قربت سے؟ معصوم سی چھوٹی سی۔ کانچ ایسی نازک لڑکی۔

"تم پہ ٹرے سے اور وہ بالکل دھان پان سی ہے"۔ اُسے ابھی ابھی تھوڑی دیر قبل نعیم کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

اور وہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

"بات غور طلب ہے ہنسنے والی نہیں"۔

اور وہ مزید ہنس دیا تھا۔

"بالکل ہی دھان پان سی ہے۔ دبلی پتلی سی"۔ وہ پھر بولا تھا۔

"جغرافیائی لحاظ سے پھر بھی بہت دلکش ہے"۔ اُس نے شرارت سے کہا تھا۔

"بدمعاش"۔ نعیم زور سے بولا تھا۔

اور وہ دیر تک ہنستا رہا تھا۔

پکچر ٹریجک تھی، اُس کے ذہن پر عارضی سا اثر تھا۔

رات سوتے وقت پھر اُس کی صورت نظروں میں پھرنے لگی۔ اور پھر اُس نے سرہانے رکھے فون پر اُس کے نمبر ڈائیل کر دیئے۔

"یس ثنائی فصیح احمد سپیکنگ"۔ وہ مادری زبان میں بولی تھی۔

"جاگ رہی ہو؟"۔ وہ دھیرے سے بولا۔

"جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔؟" وہ اُس کی آواز پہچان گئی تھی بنتھی ہکلانے لگی تھی۔

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ آج بجائے مشتعل ہو کر چیخنے چلانے یا پھر ڈانٹنے کے وہ بوکھلا گئی تھی۔

"پھر گھبرا گئیں؟"۔

"جی نہیں تو۔۔"

"اچھا بتاؤ مجھے دیکھ کر گھبرا کیوں جاتی ہو؟"۔

تیز تیز سانسوں کے ساتھ اُسے مدھم سی ہنستی کی آواز سنائی دی۔

"پکچر اچھی لگی؟"۔

"جی"۔ وہ کچھ سنبھلتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

اور وہ پھر مسکرا دیا۔

پچھلے چند دنوں سے وہ بھی کچھ سہمی سہمی سی دبی دبی سی رہنے لگی تھی۔

"تم سیٹ کیوں بدلنے لگی تھیں؟"۔ وہ شاکی سے لہجے میں بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"بولو نا"

"کیا کہوں؟"

"سیٹ کیوں بدلنے لگی تھیں؟"

"یوں ہی۔۔"۔

"مجھے معاف نہیں کیا اب تک؟"

"اوہ"۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"بولو نا"۔

"مجھے نیند آ رہی ہے"۔ وہ جواب دینے سے کترا رہی تھی۔

"اچھا سو جاؤ"۔ اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا۔

چند لمحے وہ خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتی رہی۔

کیا وہ واقعی چاہتی تھی کہ وہ بولنا بند کر دے؟ کیا نیند کا اس نے اسی لئے بہانہ بنایا تھا؟ یا وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ اور اسی لئے نیند کا کہہ دیا تھا۔ یہی تجزیہ کرتے کرتے وہ اٹھی۔ کمرے کی لائٹ آف کی اور سرہانے کا لیمپ آن کرتے ہوئے بستر میں گھس کر پوئٹری کی کتاب کھول لی۔

تبھی کوئی گھنٹے بھر بعد پھر گھنٹی بج اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے ریسیور

اُٹھایا۔ اور اُسی طرح کتاب پر نظریں جمائے کان سے لگا دیا۔

"جی۔ کون بول رہا ہے؟" وہ بے دھیانی سے بولی۔

"تو محترمہ کو نیند آرہی تھی؟"۔

"اوہ آپ ہیں؟"

"تو تم مجھے جانتی ہو؟"۔

وہ سٹ پٹا کر رہ گئی۔

"اوہ۔ ہاں میرا نام تو تمھیں معلوم ہی ہے۔ اچھی طرح ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی؟"

"ایک بات پوچھوں؟"

"جی"

"تم نے مجھے ڈانٹا نہیں ۔ ۔"

اُس کی سانسیں پھر تیز ہونے لگی تھیں۔

"ہوں ۔ ۔ ۔ بتاؤ نا۔ بھئی بولو نا"۔ وہ مصنوعی جھنجلاہٹ سے بولا۔

اچھا بتاؤ مجھے معاف کر دیا ہے۔؟"۔

وہ اب بھی خاموش رہی۔ کہتی بھی کیا۔

"پھر تو نیند نہیں آرہی؟"

اور جواب میں وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"کیا کر رہی تھیں؟"۔

"پڑھ رہی تھی"۔

"پڑھائی کیا اتنی ضروری ہے کہ رات بارہ بجے بھی بیٹھ کر پڑھا جاتے "
"کل ٹسٹ ہے۔ اور آ گئے ہیں Annual Exams "
" اوہ۔ جبھی لیکچرز دیکھتی رہتی ہو"۔ وہ یوں ہی اُسے چھیڑنے کو بولا جبکہ سٹوڈنٹ لائف میں وہ صبح پیپر ہوتا تو بھی ایک ضروری کام سمجھ کر لیکچر جا کر دیکھ آتا۔
" ایک لیکچر سے کیا ہوتا ہے؟"۔
" بڑی بولڈ ہو"۔
وہ پھر ہنس دی۔
" پھر مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟"
اور اُسکی سانسیں پھر غیر متوازن ہونے لگیں۔
" اچھا گھبراؤ نہیں۔ بند کرتا ہوں۔ تمہارا ٹائم ویسٹ ہو رہا ہے۔ شب بخیر ..."۔
" شب بخیر"۔ شانی نے بھی دھیرے سے کہا۔
اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کتاب پر نظریں دوڑاتی رہی۔
" تم نے مجھے ڈانٹا نہیں؟" " اچھا بتاؤ مجھے معاف کر دیا ہے؟"۔
ساتھ ہی اُس کا سراپا اُسکی نظروں میں گھومنے لگا۔ پھر اُس نے سر جھٹکا۔ پھر سے کتاب میں جذب ہونے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر تک کامیاب بھی رہی۔
"بڑی بولڈ ہو۔ پھر مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟"۔ پھر وہی خیال! اُس نے

کتاب بند کر دی۔ خواہ مخواہ رات گنوانے سے فائدہ؟"۔
لائیٹ آف کی۔ اور بستر میں گھس گئی۔ ابھی یکبارگی فون کی گھنٹی بج اٹھی ساتھ ہی اُس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اُٹھا۔ اُسی کا تو نہیں تھا؟ ہاتھ بڑھا کر اُس نے رسیور اُٹھا لیا۔ نہیں۔ یہ تو بابا جان کا تھا۔ امریکہ سے۔ بابا جان کی کال تھی امریکہ سے۔ اس کے باوجود۔ اُسے کچھ مایوسی سی ہوئی تھی شاید۔ یا پھر وہم تھا یہ اس کا۔ بہرحال وہ بابا جان سے باتیں کرتے ہوئے سب بھول بھال گئی۔

19

وہ Mix PARTIES میں بہت کم جایا کرتی تھی۔ بلکہ جب تک وہ سولہ سال کی نہیں ہوئی تھی۔ بابا جان اُسے کبھی MIX GATHERINGS میں ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ دو تین سال سے اُنہوں نے اجازت دے دی تھی۔ مگر ایسا ہوتا بہت کم تھا کیونکہ اکثر اوقات بابا جان ملک سے باہر ہوتے اور اکیلے میں اُسے خود مکس پارٹیز اٹینڈ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔
مگر آج تو بابا جان کے معمّر دوست ملک سرور نے اتنے اصرار سے بلایا تھا۔ کہ باوجود سو بہانوں کے وہ انکار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ امتحان کا بہانہ۔ ڈرائیور چھٹی پر تھا یہ بھی بہانہ خوب تھا۔ بابا جان گھر پر موجود نہ تھے ——
"میں جو تمہارے باپ کی جگہ ہوں"۔ کہہ کر اُنہوں نے اس کا آخری بہانہ

بھی ناکامیاب نبا دیا تھا۔
"فصیح احمد نہیں ہیں بیٹی! تو تمہیں اُن کا خلا پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ تمہارا انکل تم سے ناراض ہو جائے گا۔" اُردو بولتے ہوئے بھی اُن کے لہجے سے پشتو کی صاف مہک آرہی تھی۔
"اوہ! نہیں انکل میں آجاؤں گی۔" اُسے حامی بھرنا ہی پڑی۔
اُس نے فون کرکے اپنے وکیل کی گاڑی منگوائی، بابا جان کا ڈرائیور عموماً اُتنا ہی عرصہ چھٹی کرتا۔ جتنا بابا جان باہر گزارا کرتے تھے۔ وہ بابا جان سے شکایت بھی کرتی۔ مگر وہ مسکرا کر ٹال دیتے۔
"بیٹے زیادہ سختی کرنا اچھی بات نہیں۔ اُسے بھی اپنے بچے یاد کرتے ہوں گے جس طرح تم مجھے یاد کرتی ہو۔" اور
وہ مسکرا کر رہ جاتی۔ شانی کا ڈرائیور آج ہی چھٹی لے کر گیا تھا۔ کچھ گرم کپڑے خرید کر اپنے بچوں کو سنبھالنے بیس میل پر واقع اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ کل کا دن گزار کر اگلے دن واپس آنا تھا۔
اُس نے سبز رنگ پر سرخ رنگ کا چیک گرم فلیپر اور کوٹ پہنا۔ بالوں کا سادگی سے جوڑا بنا کر اُوپر سے کپڑوں کا ہم رنگ خوبصورت سکارف باندھا اُسی رنگ کے سمارٹ جوتے پہنے۔ لباس پر اپنی مخصوص خوشبو چھڑکی، اور باہر پورچ میں آکر کار میں بیٹھ گئی۔
"شانی بیٹی! موٹر واپس آئے گی۔ وکیل صاحب کو کچھ کام ہے۔ ڈرائیور کو وقت بتا دو، مقررہ وقت پر لینے پہنچ جائیگا۔" ماما نے ایکبار پھر تاکید کردی۔

"اچھا ماما"۔

"خدا حافظ" ماما نے کہا۔ اور

ہاتھ ہلا کر انہیں جواب دیتے ہوئے وہ کار میں بیٹھی گیٹ سے باہر نکل گئی

چند مہمان آئے بیٹھے تھے جن میں دو چار لیڈیز بھی تھیں۔ چند مقامی سرکاری افسروں کی بیویاں مکس پارٹیز میں اکثر دکھائی دیتیں۔ اُس کا ان کے ساتھ آنا جانا تو نہیں تھا۔ مگر جان پہچان ضرور تھی۔ وہ

انہی کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ دو مہمان اور بھی آ گئے۔ اُسے کچھ مزہ نہیں آ رہا تھا۔ انکل سرور کے اصرار پر وہ آ تو گئی تھی۔ مگر کچھ بوریت سی ہو رہی تھی۔ خواتین مہمان شادی شدہ اور عمر میں اُس سے بہت بڑی تھیں۔ کوئی common Topic نہیں تھا۔ اس کے پاس۔ اور بھی ایسی کوئی خاص attraction کی بات نہیں تھی۔ مگر۔

"ورنہ تمہارا انکل تم سے ناراض ہو جائے گا۔" انکل کا پرخلوص لہجہ اُسے یاد آیا۔ اور

وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے سامنے دیکھنے لگی۔

تبھی انکل پاس والے دروازے سے ہال میں داخل ہوئے۔

"ہیلو ثنائی بیٹے۔ اچھا ہوا تم آ گئیں ورنہ آج تمہارے انکل کی ناراضگی یقینی تھی۔" انہوں نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"تم جانو بیٹی! میں پورا مہینہ لاہور گزار آیا۔ آج تیسرا دن ہے واپس آئے۔

نئے ڈی۔سی پوسٹ ہو کر آئے ہیں۔ میں بلا نہیں سکا تھا۔ آج وقت نکال ہی لیا۔ سوچا تم بھی آجاؤ گی۔ فصیح احمد کے پروگرام کا بھی پتہ چل جائے گا تم سے۔" پھر انھوں نے گھڑی پر نظر ڈالی "مہمان تقریباً سبھی آگئے ہیں۔ ڈی سی صاحب بھی بس پہنچتے ہی ہوں گے۔ تم بیٹھو بیٹی! میں ذرا شیخ ارشد سے دو دو ہاتھ کر آؤں"۔ وہ پچاس پچپن سالہ شیخ ارشد کو آتے دیکھ کر اُن کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرا کر بولے

وہ پھر ہولے سے مسکرا دی۔

انکل نے بہت بشاش طبیعت پائی تھی۔ ساٹھ سال کے قریب عمر تھی۔ مگر مزاح طبیعت کا خاصہ بن چکا تھا۔

"سنا ہے نئے ڈی سی بہت اچھے انسان ہیں"۔ قدرے فاصلے پر بیٹھے ایک صاحب کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

"ارے۔ تو کیا آپ ملے نہیں ہیں اُن سے؟" دوسرے نے جواب میں کہا "وہ درحقیقت بہت شریف اور ملنسار ہیں۔ امیر غریب سے یکساں برتاؤ خوش اخلاق۔ خوش مزاج۔ میں تو کہتا ہوں کم ہی ڈی سی ایسے آئے ہونگے یہاں"۔

وہ دلچسپی سے اُن کی گفتگو سن رہی تھی۔

ڈی سی سے کچھ عرصہ قبل اُس کی بھی باتیں ہوئی تھیں فون پر۔ تب اُسے بھی وہ بہت اچھے لگے تھے۔ پھر۔ اُن کا۔ بیٹا۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ اچھا یا۔ برا۔ کچھ نہ کچھ رشتہ اُس کے ساتھ بھی تو تھا۔ لفنگوں جیسی حرکتیں کرنے والا۔ اُنہی ڈی سی کا بیٹا۔ آج کل اپنی مسحور کن شخصیت کی طرح مسحور کن باتیں بھی کرنے لگا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرادی۔
واقعی اُس کی شخصیت متاثر کرنے والی شخصیتوں میں سے تھی۔
لمبا قد، چوڑے شانے، سرخی مائل کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی سر بولتی بے حد خوبصورت آنکھیں، پرکشش نقوش۔ گھنے ڈارک براؤن بال۔ موسم کے لحاظ سے بہترین سوٹ زیب تن کئے وہ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

"ڈی سی صاحب آگئے ہیں۔" کسی نے اُس کے پاس سے ہی کہا تھا۔ اور وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی تھی۔ کافی دیر تک کوئی اور اندر نہ آیا۔ تو کیا وہ اکیلا ہی آیا تھا؟۔ پھر۔
"ڈی سی صاحب آگئے ہیں۔" جس شخص نے کہا تھا وہ اُس سمت دیکھنے لگی۔ ہال میں موجود سبھی حضرات کھڑے تھے۔ اور وہ ایک ایک سے باری باری ہاتھ ملا رہا تھا۔ انکل سرور اُس کے ساتھ ساتھ تھے۔ اور ہر ایک سے اس کا تعارف کرائے جا رہے تھے۔
"یہ شائستہ فصیح احمد ہیں۔ یہاں کے رئیس فصیح احمد صاحب کی صاحبزادی" اُس کے قریب پہنچتے ہوئے انکل سرور نے اس کا بھی تعارف کرا دیا۔
شائی نے دیکھا ایک پل کو وہ جیسے ٹھٹھک سا گیا تھا۔" اور شائی بیٹے! یہ ڈی سی صاحب ہیں۔ تمہارے پڑوس ہی میں تو رہتے ہیں۔ لیکن ارے۔۔۔" انہیں جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔" تم کہاں ملی ہوگی؟ فصیح احمد تو ہیں نہیں یہاں۔۔۔"
"آپ سے مل کر خوشی ہوئی"۔ اس کی متحیر آنکھوں میں بھرپور نظروں سے دیکھتے

ہوئے اُس نے کہا تھا ۔
اور ۔ شائی کو محسوس ہُوا ۔ وہ نیچے ہی نیچے دھنستی چلی جا رہی ہے ۔
وہ مسکراتے ہُوتے ملک سرور کی ہمراہی میں آگے بڑھ گیا تھا ۔ اور شائی کو لگا تھا ۔

آج کا مذاق سب سے بڑا تھا ۔ آج اُس نے اُسے گزرتے ہوئے دنوں سے کہیں بڑھ کر بیوقوف بنایا تھا ۔

تمام لوگ میز کے گرد سمٹ آئے تھے ۔ نہ چاہتے ہُوئے بھی وہ قریب آگئی تھی ۔ خالی پلیٹ ہاتھ میں لئے وہ جیسے اب بھی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی ۔
"یہ سوچ رہی ہو ؟" جانے کس طرح ؟ وہ اتنے سارے لوگوں کی نظریں بچا کر اُس کے پاس چلا آیا ۔

پھر ملا ملتبید اپنی بھری ہوئی پلیٹ میں سے روسٹ کا پیس ، چاول اور سلاد اُس کی پلیٹ میں ڈال دیئے ۔ اور خالی پلیٹ لئے اُس کے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا ۔

کتنی اپنائیت سے اُس نے یہ سب کیا تھا ۔ اتنے بڑے مذاق کے بعد اُس سے بے طرح ناراض ہونے کے بعد بھی وہ ہولے سے مسکرا دی ۔
اُس نے دیکھ لیا تھا ۔ کہ وہ خالی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے کب سے کھڑی ہے ۔ پھر بجائے پوری ڈش اُٹھانے کے وہ چند چیزیں بظاہر اپنی پلیٹ میں نکال کر اُس کے لئے لے آیا تھا ۔ کوئی ڈش اُٹھا کر اُسے پیش کرتا ۔ تو یقیناً لوگوں کی نظروں کا مرکز ہو جاتا ۔ لوگ ۔

جو اُسے طرح طرح کے کھانے پیش کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں کوشاں نظر آرہے تھے۔ ملک سرور کے علاوہ بھی کئی لوگ ڈبے کی سبجی اور دیگر لذیذ ڈشیں اُسے پیش کرنے میں مصروف تھے۔ پھر شائی نے دیکھا۔ اُس نے روسٹ کا ایک پیس پلیٹ میں لیا تھا۔ اور مختلف لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے وہی کھانے پر اکتفا کیا تھا۔

تو ڈپٹی سی کا بیٹا بذاتِ خود ڈی سی تھا؟۔

"دراصل۔ میں فیل ہو گیا تھا۔ میں بی اے میں پڑھتا ہوں"۔ اُس کے کہے ہوئے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

کتنا بہت سا کھانا لایا تھا اُس کے لئے؟ اور خود ایک ہی پیس روسٹ کا کھائے جارہا تھا۔

کھانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

اُس کے تو محسوسات عجیب سے ہورہے تھے۔

"میرے پاؤں میں گھنگرو بندھا لے تو پھر میری چال دیکھ لے"۔ کمر میں کس کر بندھا ہوا سکارف اور زور سے ٹھمکا لگاتا ہی شخص اُسے یاد آیا۔

"پتنگ اُڑائیں گی؟"۔ ندی کے چبوترے پر وہ پتنگ کی ڈور اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا تھا۔

پھر اُسے یاد آیا کیسا تاک کر اُس نے سیب مارا تھا اس کی کمر میں۔

اور پھر دونوں ماما اس کی نیل پڑی کمر پہ پالش کرتی رہی تھیں۔

پستول کے دھماکے بھی اُسے یاد آگئے۔

سکوٹر پر وہ عین اُس کے قدموں میں آن کر گرا تھا۔ پھر اُسے اچانک یاد آیا۔ اُس نے اس کے خلاف اُسکی شکایت اُس کے باپ کو کر دی تھی۔

تو کیا وہ خود اپنا باپ بنا اپنی شکایت اُسکی زبانی سُن رہا تھا؟۔ وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔

"میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا تھا۔ تم نے اتنا سیریس لے لیا ہے؟"۔

اُسے کمر سے تھامے وہ اسکی طرف کی سیڑھیاں چڑھتا ملائمت سے کہہ رہا تھا۔

" بتاؤ مجھے معاف کر دیا ہے؟"۔ ابھی اُس رات ہی وہ فون پہ پوچھ رہا تھا۔

چکراتے ذہن کے ساتھ اُسکی حرکتیں۔ اُس کی باتیں اُس کے تصور کے پردے پہ آتی اور جاتی رہیں۔

" شائی بیٹے!" ملک سرور اُس کے پاس کھڑے اُسے کچھ کہہ رہے تھے۔

" جی انکل"۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

ان کے ساتھ ہی وہ بھی دھیمی مسکان ہونٹوں پہ لئے کھڑا تھا۔

"تمہاری ماما کا فون آیا ہے کہ میں تمہیں گھر پہنچا دوں۔

وکیل صاحب کی گاڑی ذرا دیر سے فارغ ہو گی۔ مگر ڈی سی صاحب کہتے ہیں کہ وہ تمہیں گھر چھوڑتے جائیں گے"۔

" جی؟ ۔ انکل ۔ ۔ ۔ ؟"۔ اُس کی عجیب سی پوزیشن ہو گئی۔ نہ انکل کے سامنے انکار کر سکتی تھی۔ نا ہی اقرار کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اتنا زبردست دھوکہ بھی تو دیا تھا اُس نے۔

"میں چھوڑ جاؤں گا انکل۔ آپ فکر نہ کریں"۔ اُس نے شائی کے دیکھا دیکھی ملک سرور کو یوں اپنا ئیت سے "انکل" کہا۔ کہ انکل جھوم ہی تو اُٹھے۔
"شکریہ بیٹے"۔ اُنہوں نے کامران کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
اور شائی نے دیکھا جس دوران وہ سوچوں میں مگن تھی۔ تقریباً آدھے لوگ جا چکے تھے۔
"چلیئے"۔ وہ سنجیدگی سے شائی سے مخاطب ہُوا۔
اور نہ چاہتے ہوئے بھی حیرزدہ سی ہوتی وہ دروازے کی سمت بڑھی۔
کامران نے بھی سب سے ہاتھ ملایا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔
"بیٹھو بیٹی"۔ انکل سرور نے اُس کے لئے کامران کی کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
وہ آہستہ سے سیٹ پر جا بیٹھی۔ انکل سرور نے اُس کا دروازہ بند کر کے کامران سے ہاتھ ملایا۔
"خدا حافظ"۔ کامران نے کہا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔
انکل ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ کامران نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ اور اُن کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے چل دیا۔

۲۰

گیٹ سے باہر نکل کر قدرے فاصلے پر اُس نے کار روکی۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ "آگے آجاؤ"۔ پچھلی طرف آکر اُس کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ بلا تمہید بولا۔

"یہیں ٹھیک ہے"۔ وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"یہاں ٹھیک نہیں ہے"۔ وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولا

"میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی"۔ کار سے اُترتے ہی وہ بولی۔

ناراضگی کے ساتھ ساتھ اُس کا چہرہ بھی پھولا ہوا تھا۔

"اب تو آگئی ہو"۔ خوبصورتی سے ہنستے ہوئے اُسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے کار کے پیچھے سے گھوم کر وہ اگلی طرف آیا۔

"تشریف رکھو"۔ دروازہ کھول کر اُسے زبردستی بٹھاتے ہوئے اُس نے کہا۔ اور

دروازہ بند کر کے سامنے سے گھوم کر اپنی سیٹ پر آگیا۔

"آج پچھلے کئی دنوں سے کہیں زیادہ ناراض نظر آرہی ہو۔ کیا بات ہے؟"۔

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے اُس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

اور اُس نے رُخ خاموشی سے کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔

"اوہ۔ واقعی ناراض ہو۔ معاف نہیں کرو گی؟" وہ آہستہ آہستہ موڑ کاٹتے ہوئے کہتا گیا۔

"تم نے پہلی خطائیں معاف نہیں کیں ۔ یہ کیا معاف کرد گی ؟" ۔
"بھئی کچھ تو کہو نا ؟" اپنا سر اُس کے کندھے سے چھوتے ہوئے اس نے خوش دلی سے کہا ۔

مگر وہ چُپ چاپ اندھیرے میں باہر گھورتی رہی ۔

وہ بھی خاموش ہو گیا ۔ دلنشیں مسکراہٹ البتہ ہونٹوں پر اب بھی بکھری چلی آ رہی تھی ۔

کار سڑک کی گولائیاں گھومتی دھیرے دھیرے چڑھائی پر چڑھتی جا رہی تھی، اب وہ اُونچائی پر بنے چھوٹے چھوٹے کچے مکانات کے دامن میں سے گزر رہے تھے ۔

تبھی ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا اچانک ہی اُچھل کر شانی کی کھڑکی تک آ رہا ۔

"ہائے اللہ" وہ بے طرح گھبرا کر کامران کی طرف سمٹ آئی ۔

"شیشہ چڑھا ہوا ہے" ۔ وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا ۔

کتا اب بھی بھونکتا ہوا ساتھ ساتھ بھاگا چلا آ رہا تھا ۔ موڑوں کی وجہ سے کار کی رفتار بھی دھیمی تھی ۔ کتے کا چہرہ بند شیشے کے ساتھ لگا واقعی بھیانک لگ رہا تھا ۔

مزید سمٹتے ہوئے اُس نے ڈیش بورڈ تھام لیا ۔

"گھبراتی کیوں ہو شیشہ تو بند ہے" وہ اُس کی طرف جھکتے ہوئے نرمی سے بولا ۔

مگر ــــ

رنڈا رہی تھی۔ کُتّے کا بھیانک چہرہ مسلسل ساتھ ساتھ رواں تھا خطرہ
یقینی دیکھ کر اُس نے چہرہ اپنی گود میں چھپا لیا۔
وہ واقعی بہت چھوٹی تھی۔ بے حد معصوم۔ ایک پل کو اُس نے پیار سے
اُسے دیکھا۔ پھر دھیرے سے اس کا سَر اپنے پہلو سے لگا لیا۔
"ڈرو نہیں۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں"۔ اُس کے لہجے میں پیار اپنے انتہا
پر تھا۔
اور وہ بے خطرہ پھیلا کر یک دم ہی اُس کا ہاتھ جھٹک کر دور ہٹ گئی۔
وہ دھیرے سے ہنس دیا۔
مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اور کتا سعیٔ لا حاصل کے بعد اپنے ہی
حدود میں ہنوز بھونکتا پیچھے رہ گیا تھا۔
"تمہارے باباجان کب آ رہے ہیں؟" تدرے توقف کے بعد وہ سنجیدگی
سے بولا۔
"نہیں معلوم"۔ کھڑکی کے اُس پار اندھیرے میں گھورتی وہ پھولے پھولے
مُنہ کے ساتھ بولی۔
"اوہ۔ امتحان کب ہو رہے ہیں؟"۔ اُس نے پھر پوچھا۔
وہ خاموش رہی۔ اتنا زبردست مذاق کرنے کے بعد وہ کس اطمینان سے
اُس کے ساتھ باتیں کیے جا رہا تھا۔
"بھئی بتاؤ نا کب شروع ہو رہے ہیں؟ کب ختم ہوں گے؟"
"نہیں پتہ"۔ وہ ہنوز رُخ پھیرے اُسی انداز میں بولی۔

"تم تو سچ مچ ناراض ہو"۔ سڑک پر نظریں جمائے اُس نے اس کا سیٹ پر رکھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اور رشائی کو جیسے بجلی چھو گئی۔ اُس کا ہاتھ زور سے جھٹکتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ہائے رے"۔ وہ شرارت سے سٹیرنگ پر جا گرا۔ "کارِ رخ ایسی نازک ـــــ اور اتنے زور کا جھٹکا۔ ویسے اے مس! یہ تو بتاؤ بی اے کے بعد کیا کرو گی؟" اس کی پڑھائی سے متعلق تمام معلومات اُسے نعیم سے پتہ چلتے رہتے تھے۔

اور رشائی مزید کھڑکی کی طرف سمٹ گئی۔ جواب کچھ نہیں دیا۔

"اُفوہ۔ کیا چیز ہو؟" وہ جھنجھلا سا اُٹھا۔ "بولتی کیوں نہیں ہو۔ میں نے کہہ تو دیا تھا۔ سب میں نے مذاق کیا تھا۔ تمہیں تنگ کرنے کو یہ سب کرتا تھا۔ یہاں کا چارج لیتے ہی میں نے چاہا تھا تمہارے باباجان سے ملوں۔ میں نے فون پر تم سے ان کے متعلق دریافت کرنا چاہا۔ تو تم نے چھوٹتے ہی کہا۔

"آپ کا نام لوفر ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے"۔ پھر میں سچی لوفر بن گیا۔ تمہیں چھیڑا۔ تنگ کیا۔ تم چڑ گئیں اور واقعی تنگ آ گئیں۔ تو میں نے مذاق ختم کر لیا۔ تم سے معافی مانگ لی۔ سوچا تم نے معاف کر دیا ہے۔ مگر۔۔۔" وہ قدرے رکا۔ اُس کی طرف دیکھا۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف نہیں تھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"آج پچھلے دنوں سے کہیں زیادہ بھولی بیٹھی ہو۔ اتنی دیر سے بکواس کئے جا رہا ہوں۔ جواب ہی نہیں دیتا"۔ وہ جھنجھلایا سا سامنے دیکھتا

ڈرائیو کرتا گیا۔

تبھی شانی کو یاد آیا۔ کچھ عرصہ قبل واقعی یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کے فون سے پہلے کوئی شخص برابر رنگ کر کر کے اسے تنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جھلائی تو وہ بیٹھی ہی تھی۔ جوں ہی کامران نے بات شروع کی۔ اس نے وہی کچھ اگل دیا۔ جس کا درحقیقت وہ پہلا شخص مستحق تھا۔

تو یہ سب اس ایک جملے کا ردِ عمل تھا۔؟ سوچتے سوچتے وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

اس کی جھنجھلاہٹ پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔ سامنے دیکھتے ہوئے اس نے نظریں سڑک پر جما دیں۔

"اب بھی نہیں بولو گی؟" رخ اس کی طرف کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں رعب تھا۔ تحکم تھا۔

اور شانی کوئی جواب دیے بنا اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ناراض ہو اب بھی؟" کار ایک طرف روکتے ہوئے وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ لہجہ اب بھی وہی تھا۔ بارعب سا۔ حاکمانہ سا۔

وہ واقعی مرعوب سی ہو گئی۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ پلکیں جھپکاتی خاموش منھی بنی کیسا کیا پریشان کیا تھا۔ اس نے اسے۔ ناراض تو وہ ضرور تھی۔ بہت زیادہ۔

"تنگ کیوں کر رہی ہو۔ بولو نا۔" وہ مزید جھنجھلا کر بولا۔ لہجہ پہلے سے کئی گنا بارعب اور حاکمانہ ہو گیا۔

عجیب تھا۔ تنگ تو اس نے کیا تھا۔ بجائے پشیمان ہونے کے۔ الٹا جھنجھلایا

جا رہا تھا۔ رعب ڈال رہا تھا۔ حکم چلا رہا تھا۔ جانے کیوں؟ اُس کی آنکھیں چھلملا اُٹھیں۔ پلکیں تیزی سے گرنے اُٹھنے لگیں۔

"چلو جھٹی ہو گئی۔" دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے وہ گہری سانس لے کر بولا۔ اور دو موٹے موتے آنسو لڑھک کر اُس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

چند لمحے وہ یوں ہی اُسے تکتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم مجھے اچھی لگتی ہو شائی" یکے بعد دیگرے اُس کے گالوں پر سے آنسو اپنے ہونٹوں میں اُٹھاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

شائی مزاحمت کے لئے مچلی۔

"پلیز شائی۔" اُس کی دونوں بھیگی بھیگی آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے وہ تڑپ کر بولا۔ "I love you, I am mad in love with you"

اُس نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ پھر دھیرے دھیرے کہتا گیا۔

"مجھے تم سے پیار ہے شائی۔ کب سے ہے؟ کب ایسا ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ بس اتنا یاد پڑتا ہے کہ۔ تم سے آخری چھیڑ چھاڑ میں ایسا ہوا تھا۔ تم مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ اچانک ہی۔ اور بہت شدت سے۔۔۔۔" جانے کیا کیا کہہ رہا تھا وہ؟—

شائی اپنے کو اُس کی گرفت سے چھڑا کر کھڑکی کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"تنگ بھی کرتی ہو۔ پھر روتی بھی ہو۔" کار سٹارٹ کرتے ہولے سے اس کا سیٹ پر رکھا ہاتھ دباتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اتنی سی ہو"۔ اُس نے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے بالشت بھر کا فاصلہ بنایا۔" شو کیس میں سجنے والی گڑیا جتنی ۔۔۔ مگر پتہ ہے۔ پھر بھی اتنے بڑے آدمی کو مار گرایا ہے"۔ خوشدلی سے ہنستے ہوئے وہ ڈرائیو کرتا گیا۔

"اب تو ناراض نہیں ہونا؟"۔ اُن کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے پھر پوچھا۔

وہ خاموشی سے اُسے تکنے لگی۔

"میں پھر ہاتھ جوڑتا ہوں"۔ پورچ میں کار روکتے ہوئے اُس نے واقعی مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دئیے۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی ... انداز میں۔

کامران اُتر کر سامنے سے گھومتا اُس کی طرف آیا۔

دروازہ کھولا۔ اور وہ باہر نکل آئی۔

"شب بخیر"۔ کامران نے ہولے سے کہا۔

کوئی جواب دیئے بنا وہ اب بھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

ناراض سی۔ شاکی سی نظروں سے۔

پورچ کی تیز روشنی میں اُس نے دیکھا۔ کچھ دیر قبل رونے سے اُس کی شربتی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

ناراضگی کے سائے بھی نمایاں ہو رہے تھے۔

اور۔ اور۔ شاکی انداز مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اتنے سارے حسین جذبوں کی تاب نہ لا کر وہ بے بسی سے مسکرا دیا

کار کے سامنے سے گھومتا واپس اپنی سیٹ پر آیا۔ اور اُسکی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر جانے والی گیٹ کی طرف ہو لیا۔

۲۱

دِن تیزی سے گزرنے لگے۔ ڈنر کے بعد سے اُس پر رازِ دِل کھولنے کے بعد تو وہ جیسے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس کیلئے کیسا کیسا دِل مچلتا تھا۔ اُس سے ملنے کو۔ اُس سے باتیں کرنے کو۔

مگر وہ موقعہ ہی نہیں دے رہی تھی۔ اوّل تو ٹیرس پر کم آتی۔ پھر آتی بھی تو کتاب ہاتھ میں لئے۔ اور سنجیدگی سے محوِ مطالعہ نظر آتی۔

رات دیر تک اُس کے کمرے میں لائٹ آن رہتی۔ یقیناً امتحان قریب تھے۔ اور وہ تیاری میں منہمک۔

مگر۔

وہ اپنے دِل کا کیا کرتا؟۔ اُسے جو کسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔

آج سات دن کے طویل سرکاری دورے کے بعد وہ گھر پہنچا تھا کیسا کیسا بیقرار ہوا تھا وہ یہ سات دن۔ جیسے صدیاں ہوں سات۔ تب اُسے احساس ہوا۔ وہ ملتی نہ ملتی۔ نظر آتی نہ آتی۔ وہ گھر پر ہوتا تھا تو اُس کی قربت کے احساس سے مطمئن ضرور رہتا تھا۔

ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ اور نعیم امتحان کی تیاری

کے لئے ہوسٹل جا چکا تھا۔ اُس نے بستر میں ہی ایک کپ سٹرونگ سی کوفی پی پھر کپڑے بدلنے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈریس اپ ہوتے ہوتے اس کی نظریں کھڑکی سے اُس پار پہنچ پڑیں۔

شائی ٹیرلیس پر رکھے ایک پھولوں کے گملے کے سامنے دو زانو بیٹھی جیسے محو تھی بالکل۔

آج وہ ضرور اُس سے ملے گا۔ باتیں کرے گا۔ آج اس کے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی۔ گملے میں لگے پودے کو محویت سے دیکھے جا رہی تھی۔ پڑھائی سے اُکتا کر فریش ہونے کا یہ اچھا انداز تھا۔

کوٹ پہنتے پہنتے اُس نے ایک نظر قدِآدم آئینے پہ ڈالی۔ اور بڑے بڑے قدم اُٹھاتا اپنے باتھ روم کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

برآمدے کی کونے والی سیڑھیاں اُترتا اندرونی لان کے کنارے چلتا اب وہ اپنے حدود کے آخری سرے پر گامزن تھا۔

شائی واقعی محو تھی۔ رخ اگرچہ اُسی کی طرف تھا مگر پھر بھی اُس کی آمد کا احساس تک نہ ہوا۔

"ہیلو میم صاحب"۔ ریلنگ کے قریب پہنچ کر اُس نے ہولے سے کہا۔ مگر اس کے باوجود وہ جیسے اُچھل کر رہ گئی۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔ مہناز۔ تو وہ خاصی واقع ہوئی تھی۔ یہ تو اُسے پہلے ہی معلوم تھا۔

شائی نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ڈریسنگ پر سنبھلی والا لوفر ہونٹوں پہ مسحور کن مسکراہٹ لئے مشتاق نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں جیسے قندیلیں سی جل اُٹھیں۔ خوبصورت لب متبسم ہو گئے۔ مگر۔ دُوسرے ہی لمحے جلتی قندیلوں کی جگہ ناراضگی نے لے لی۔

ہونٹ البتہ اب بھی دھیمی مسکان لئے ہوئے موٹ تھے۔

اُس کے "ببلو" کا خواب دیئے بنا وہ اپنے سامنے گملے میں لگے ننھے ننھے لال لال پھولوں کو دوبارہ تکنے لگی۔ "بعض چیزیں بڑی قسمت والی ہوتی ہیں" اُس کے انداز پُر حیرت سے مسکراتا وہ پھر بولا۔

وہ چکنے فرش پہ بیٹھی اُس کی اَن سنی کرتے ہُوئے اب بھی پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اے میڈم"۔ قریبی پودے سے بڑا سا پھول توڑ کر اُسے متوجہ کرنے کو اُس پہ پھینکتے ہُوئے وہ پھر بولا۔

گود میں گرے پھول کو دھیرے سے پرے ہٹاتی وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"مجھ سے اچھی اِن پھولوں کی قسمت ہے جنھیں کتنی دیر سے بیٹھی تم پُوج رہی ہو"۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے وہ کہہ رہا تھا۔

اُس کی نظروں کی تاب تو وہ کبھی نہ لا سکی تھی، پلکیں گرانے اُٹھانے لگی۔ چہرہ مزید گلابی ہو گیا۔ "پتہ ہے ان پھولوں کو کیا کہتے ہیں؟" قدرے توقف کے بعد وہ اچانک بولا۔

اور وہ اپنی بے تحاشہ خوبصورت آنکھیں پُوری کھول کر اُسے دیکھنے لگی۔

اُسے تو واقعی اِن ننھے منے لال لال پتیوں والے پھولوں کا نام نہیں آتا تھا۔

نہ البتہ اُسے بہت تھے۔ مالی سے خاص طور سے کہہ کر اُس نے یہ گملہ ادھر ٹیرس پہ رکھوایا تھا۔
لمبی لمبی سوکھی سوکھی کانٹے دار ڈنڈی نما شاخوں پر جا بجا لگے یہ لال لال مُنّے سے پھول اُسے بے حد پسند تھے۔ چھوٹی سی جان۔ دو ہی پتیوں پر مشتمل۔ سوکھے کانٹوں میں بسیرا نے ہوئے تھی جیسے۔
"نہیں معلوم؟"۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اُس نے پھر پوچھا۔
اور اُس نے اُسی شاکی انداز میں سر نفی میں ہلا دیا۔
"میں بتا دوں؟"
وہ خاموشی سے اُسے پھر تکنے لگی۔
"پھر کھوئی لونڈر ہے"۔ وہ آہستہ سے ہنس دیا۔
اور وہ بھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خوبصورتی سے ہنس دی۔
"شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے"۔
اور وہ مزید ہنس دی۔
"Kiss Me Quick"۔ وہ اُس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "اِن پھولوں کا نام ہے"۔ اُس نے جلدی سے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ مگر۔
اِس کے باوجود اُس کی پلکیں یکبارگی جھک گئیں۔
اور چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔
کامران محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ کیسا آن گھیرا تھا اُسے۔

"دو PS انا جیسے بنے ہیں نا"۔ وہ مزید بولا۔
اور شائی کے چہرے کی تپش میں مزید اضافہ کر گیا۔
"دیکھو اب اور نہ ناراض ہو جانا۔ پچھلی ناراضگی کافی ہے۔ میں نے صرف نام بتایا ہے نہیں ان پھولوں کا۔ تمہیں اتنے پسند ہیں۔ تو نام بھی معلوم ہونا چاہیئے۔"
اور وہ اُس کے انداز پر سر گھٹنوں پر ٹیکتے ہوئے مسکرا دی۔
"امتحان کب شروع ہو رہے ہیں؟"۔ اگرچہ اُسے ... معلوم ہو چکا تھا۔
بی اے کے امتحان میں صرف ایک ہفتہ رہتا تھا۔
وہ سر گھٹنوں سے اُٹھا کر اُسے کوئی جواب دیئے بنا اپنے ہاتھ کے خوبصورت ناخنوں کو تکنے لگی۔ "تو آج بھی نہیں بولو گی تم؟"
اور اُس نے سر دھیرے سے نفی میں ہلا دیا۔
"اوہ۔ میں۔ میں۔" مارے جھنجھلاہٹ کے وہ بول ہی نہ سکا۔
اور وہ لال لال منہ سے پھول کو چھوتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی۔
"ناراض ہو اب تک؟"۔
شائی نے اب بھی سر نفی میں ہلا دیا۔
"پھر؟"۔
وہ اب بھی چپ رہی۔
"آخر کیوں نہیں بولتی ہو؟"۔
اُسے تو اس کی جھنجھلاہٹ میں مزہ آ رہا تھا۔ شاید بول ہی لیتی۔ آخر تو اُنکی ایسی کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ مگر یوں چپ سادھ کر اُسے تنگ کرنا۔ اُسے اچھا

لگنے لگا تھا۔ اُس کی پچھلی حرکتوں کا بدلہ لینے کا یہ اچھا طریقہ ہاتھ آیا تھا۔

وہ اب بھی نہیں بولی۔

"نہ بولو۔ میں بھی دیکھوں گا کب تک نہیں بولتی ہو"۔ وہ مشتعل سا ہو گیا۔

اور وہ آہنی لال لال ننھے منے پھولوں کے مزید قریب سمٹ آئی۔

"تم پوجا کرو۔ میں چلتا ہوں"۔ وہ جھنجلایا جھنجھلایا باڑ کی پتیاں نوچتا وہاں سے چلا آیا۔

۲۲

اُس نے تو ایسی چُپ سادھ لی تھی۔ کہ اُس کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیتی۔ خاموشی سے گھنی خوبصورت پلکیں اُٹھا کر اُسے گھورتی اور بس۔

یا پھر زیادہ سے زیادہ معصوم سے انداز میں سر کی ہلکی سی جنبش سے "ہاں" یا "نہ" کر دیتی۔

ماتھے پر شکنیں۔ نظروں میں غصہ اور آواز میں کرختگی۔ شاید اُس کی بے انتہا نزاکت کی نفی کرتے تھے۔ یا پھر

شاید وہ ان چیزوں کا بار اپنے نازک وجود پر برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔

نگاہیں اُس کی پچھلی حرکتوں کے لئے شاکی انداز لیے۔ ہونٹ خفیف سے متبسم رہتے اور بس۔

کتنا انوکھا انداز تھا ناراضگی کا۔ نرالا۔ نایاب انداز۔

آج اُس کا پہلا پیپر تھا۔ اور رات بھر وہ اُسے "وش" کرنے گیا تھا۔

نایاب گلابوں کا بڑا سا جھکتا گلدستہ ہاتھ میں لیئے وہ ... نت کی تاریکی میں ٹیرس کی طرف گیا تھا۔ اس نے قریب جا کر تالی بجائی تھی، اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اس کا ٹیرس کی طرف والا دروازہ کھل گیا تھا۔

ساتھ ہی پہلے اُس نے دروازے میں سے سر ڈال کر باہر دیکھا تھا۔ اور پھر آنکھوں میں وہی جلتے بجھتے دیپ لیئے ریلنگ تک آگئی تھی۔ چپ چاپ۔ خاموش سی" WISH You Good Luck "۔ بلا تمہید بڑے بڑے جھکتے گلاب اُسے تھماتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا تھا۔

ہاتھ میں لیتے ہی اُس نے اپنا چہرہ اُن بھیگے بھیگے تازہ تازہ گلابوں پر رکھ دیا تھا۔ اُن کی مسحور کن خوشبو سے وہ مسحور بھی ہوئی تھی۔ مگر ـــ

بولی کچھ نہیں۔ بس پھولوں ہی کو تکتی رہی۔

"کل انگلش کا پیپر ہے؟"۔ وہ نعیم سے سب پوچھتا رہتا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

وہ جانتا تھا پہلے سے۔ اُس نے سر کی جنبش بھی گوارا نہ کی۔

"پہلے بتاؤ بولو گی مجھ سے یا نہیں؟"

اور اُس نے سر معصومیت سے نفی میں ہلا دیا ...

اُس کی نفی میں "ہاں" ہوتی تھی۔ اُس کی "ہاں" میں "نا" ہوتی تھی۔

وہ مسحور سا اُسے دیکھتا رہا۔

"ایک بات کہوں؟"۔

نگاہیں اُس پر مرکوز ہوگئیں۔

"تمہاری کھلی پلکوں میں غنودگی ہوتا ہے ۔ غصہ بھی نہیں ۔ بلکہ جیسے خفا سی ہو ... مگر ...." وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتا شرارت سے ہنس دیا ۔" مگر جب ۔ کبھی کسی بات پر تمہاری پلکیں جھک جاتی ہیں ۔ تو ... لگتا ہے ... لگتا ہے ... تمہیں بھی ۔ کسی کا خیال .... آتا ہے ... " اس نے چبا چبا کر کہا ۔

اور وہ چہرہ دوبارہ پھولوں پر رکھتے ہوئے پلکیں جھپکانے لگی " اچھا اب اندر چلو ۔ سردی بہت ہے اور تم ۔ تم بہت نازک ہو ۔ بات تو تم کرو گی نہیں ۔ خواہ مخواہ ٹائم ویسٹ کیا ہے تمہارا ۔ اچھا بھئی ! آداب Wish you best of luck ہو ۔ پاس ہونا اسی بار ۔ سمجھیں ۔" وہ ہنستا ہوا وہاں سے چلا آیا تھا ۔

دن کے دو بج چکے تھے آفس میں بلا مقصد بیٹھا وہ میز پر رکھے پن سے کھیلتے ہوئے اسی کے متعلق سوچ رہا تھا ۔

وہ پیپر دے کر آ چکی ہوگی ۔ پیپر کیسا ہوا ہوگا ۔ ؟
یہ خواہش دل میں ابھرتے ہی وہ جھنجھلا اٹھا تھا ۔
انداز اگرچہ قاتل سہی ۔ تھا بہت صبر آزما ۔

اپنی محبت کے اظہار کے بعد تو وہ دیوانگی کی حد تک اس کے لئے بیقرار رہنے لگا تھا ۔

وہ کچھ بولتی ۔ بات کرتی ۔ ۔ تو تبھی وہ بھی اپنی بیقراریاں بتاتا نا اسے ۔
کس خاموشی سے اسے سزا دیئے جا رہی تھی ، ؟

خاموش نگاہوں سے متبسم لبوں سے ۔
ڈنر سے واپسی پر تو پھر کچھ "ہاں" "نا" ۔ بلکہ نا ۔ نا کر ہی لیا تھا۔ مگر
اب ۔ ایک مستقل چپ تھی ۔ اور وہ ۔ وہ پاؤں پٹختا آفس سے
اٹھ آیا۔ کھانے کے بعد سو کر اٹھا۔ برآمدے میں نکلا۔ تو دیکھا
وہ نیلگوں آسمان پہ نگاہ کیئے کھڑی تھی ۔ یا تو تازہ دم ہونے باہر نکلی
تھی۔ یا پھر شاید اسی کا صبر آزمانے ۔
تھوڑی دیر ارد گرد دیکھتی رہی ۔ اور پھر اندر چلی گئی۔ شاید اگلے پیپر کی
تیاری کرنے ۔ وہ
جھنجھلایا جھنجھلایا سا اندر چلا آیا ۔
مگر اس کے باوجود ناراضگی کا اس کا یہ انداز اسے ایسا بھایا تھا۔
کہ اٹھتے بیٹھتے ۔ چلتے پھرتے بس اسی کی شاکی نظریں ۔ اور متبسم لب ۔
اس کی نگاہوں کے سامنے رہتے ۔

۲۳

آج اس کا آخری پیپر تھا ۔ ماما سے اسے معلوم ہوا تھا ۔ اس کے تمام
پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے ۔ اور کل ہی وہ ماما کی ہمراہی میں صبح کی فلائیٹ سے
اپنے آبائی گاؤں کے لئے روانہ ہونے والی تھی ۔ کیونکہ اس سے اگلے دن مسٹر
فصیح احمد امریکہ سے سیدھے اپنے آبائی گاؤں پہنچ رہے تھے ۔

اُس کے محسوسات کچھ ملے جُلے سے ہو رہے تھے۔ وہ خوش بھی تھا۔ اور اُداس بھی تھا۔

وہ تین ماہ کے لئے جا رہی تھی۔ جبکہ وہ تین دن بھی اُسے دیکھے بغیر مشکل سے گزارتا تھا۔ وہ

چاہتا تھا۔ کہ اُس سے ملے۔ باتیں کرے۔ مگر پھر وہی۔ اُس نے آگے سے بولنا ہی نہیں تھا۔

وہ بولتی۔ تو اب تک شاید اُسے کہیں باہر لے کر جاتا۔ یا بلاتا۔ تنہائی میں ملتا۔ اپنے بےقرار جذبوں کا اظہار کرتا۔

کچھ اُس کو بھی قریب سے پرکھتا۔ وہ جو اُس کے لئے اتنا بےقرار تھا۔ کیا وہ بھی انہی جذبوں سے ہمکنار تھی؟۔

جہاں اُس کی شاکی نظروں اور متبسم لبوں سے اُس نے یہ اخذ کیا تھا۔ کہ وہ بھی اُس کے پیار کی قدر کرتی ہے۔ وہاں اُسے یہ بھی تو خدشہ تھا۔ کہ یہ محض اُس کی عادت ہی نہ ہو۔ اتنی نازک سی چیز۔ بدتمیزی اور کرختگی کا مظاہرہ کیوں کر کر سکتی تھی؟۔

نظریں اُس کی بچپلی حرکتوں پر شاکی رہتی تھیں اور لب متبسم رہتے تھے۔ تو لگتا تھا وہ بھی اُسے پسند کرتی ہے۔ مگر۔

وہ اُلجھن میں پڑ جاتا۔ پھر جھنجھلا جھنجھلا اُٹھتا۔ شام کو ٹریس پر نظر آئی تھی۔ مگر وہ پاس نہیں گیا۔ کیا فائدہ تھا پاس جانے سے؟

وہ برآمدے کے مرمریں ستون سے ٹیک لگائے یقیناً اُداس ہو رہا تھا۔

شانی نے بھی ایک نظر اُس پر ڈالی تھی۔ پھر کچھ دیر وہیں کھڑی رہی تھی۔ مگر وہ پاس نہیں گیا۔ یوں ہی اُداس چہرہ لئے اُسے تکتا رہا تھا۔

اب کم از کم اُسے دیکھتے رہنے پر تو پابندی نہیں رہی تھی۔ وہ اُسے چاہتا تھا۔ یہ شانی کو بھی معلوم تھا۔ اور اپنی پسندیدہ چیز کو لوگ دیکھتے ہی ہیں۔

صبح دس بجے وہ ایئرپورٹ جا پہنچا۔ ملک سرور بھی انہیں سی آف کرنے وہاں موجود تھے۔ اُسے وہاں دیکھ کر شانی کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ لب مخصوص انداز میں متبسم ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً اُس کی وہاں آمد پر ناراض نہیں ہوئی تھی۔

وہ ماما سے بھی ملا۔ اُن کے گاؤں کے متعلق پوچھتا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ پھر ملک سرور سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اُس کی آواز ڈوبی ڈوبی سی ہے۔ اور وہ بمشکل اپنی اُداسی پر قابو پاتے ہوئے ہے۔

"آج تمہیں بولنا پڑے گا"۔ ملک سرور ماما کو کچھ ہدایات دینے مڑے۔ تو وہ بلا تمہید بول اُٹھا۔

جانے کیوں؟ کئی دنوں بعد اُسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ پھر کچھ مرعوب سی نظر آنے لگی۔ پچھلے دنوں کی طرح بے نیازی نہ دکھا سکی۔ کچھ شاید اُس کے لہجے کا تحکم بھی تھا۔ کہ

وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگی۔ نہ اُن مخصوص شاکی نظروں سے اُسے دیکھا۔ نا ہی لب متبسم ہو سکے۔

"خط لکھو گی؟"۔ چند لمحے اُس کے جھکے سر کو دیکھنے کے بعد وہ پھر بولا۔

اور اُس نے گھبرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔
"میں لکھوں؟"۔ اس کا یخ بستہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اُس نے مزید پوچھا۔
اُس نے پھر سر نفی میں ہلا دیا۔
"شانی پلیز! آج بول لو۔ میں تمہیں ملنے آؤں گا۔
آجاؤں؟"۔ اُس کے ہاتھ کو دھیرے سے جھٹکا دیتے ہوئے اُس نے کہا۔
"نہیں"۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ سر کے بجائے منہ سے بولی تھی۔
"کیوں نہیں؟"۔
"بس نہیں"۔ وہ کیا کہتی: باباجان کیا سوچتے؟۔
اُسے معلوم تھا۔ اس کا ماحول زیادہ پابند نہ ہونے کے بعد بھی ایسا نہیں تھا۔ وہ خود بھی ان باتوں کی قائل نہیں تھی۔ لڑکے لڑکی کا ملنا جلنا۔ دوستی کرنا۔ یہ اس کے گھر کا ماحول نہیں تھا۔ کیسے وہ اُسے دعوت دیتی آنے کی؟۔ اور پھر کوئی وجہ بھی ہو؟ وہ اس کا بھائی نہیں تھا۔ کزن نہیں تھا۔ خواہ مخواہ اُسے بلاتی؟
وہ اُسے چھیڑتا تھا۔ تنگ کرتا تھا۔ پھر اب شاید پسند کرنے لگا تھا۔ مگر۔ اس طرح شاید وہ پہلے بھی پسند کی گئی ہو۔ اتنی تفصیل سے نہ سہی۔ دور در ہی سے سہی۔
کئی لڑکے اُس سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ یقیناً ان میں سے بھی وہ کسی کی پسند ہی ہوگی۔

اور بات تھی ۔ کہ اس کی پسند کا انداز نرالا تھا باقی سب سے ۔ مگر ۔
یہ سب اُس کے سوچنے کی تو باتیں نہیں تھیں ۔
بابا جان مختارِ کُل تھے ۔ اس معاملے میں ۔ اور وہ اندھا یقین رکھتی تھی ۔
اِس بات پر ۔

وہ اُسے بُرا بھی نہیں سمجھتی تھی ۔ یقیناً بہت اچھا تھا وہ ۔ لیکن ۔
اوّل تو وہ شاید آجکل کے لڑکوں کی طرح صرف دوستی کا خواہش مند تھا ۔
اور پھر ۔

اگر واقعی وہ سیریس بھی تھا ۔ دوستی سے بڑھ کر بھی کوئی جذبہ تھا ۔ اُس کے دِل میں ۔ تو وہ ۔ وہ ۔

کوئی فیصلہ خود سے کرنے کی قادر نہ تھی ۔ یہ اختیار بابا جان کو تھا ۔
آجکل کے لڑکوں کی طرح "میں ملنے آجاؤں؟" اور لڑکی آگے سے کہہ دے "ہاں"۔ وہ ہرگز ایسی باتوں کی قائل نہ تھی ۔ راہ چلتے ایسے کئی لوگ مل جاتے ہیں ۔ ہر ایک کو ENCOURAGE کرتے پھرنا اُسے اپنی تذلیل معلوم ہوتی تھی ۔

وہ سولہ سال کی پُوری ہوگئی تھی ۔ تو بابا جان اُسے پہلی بار کسی پارٹی میں اپنے ساتھ لے جانے لگے تھے ۔ جب وہ تیار ہوکر باہر کار میں ان کے پہلو میں آبیٹھی تھی ۔ تو بابا جان کہنے لگے تھے ۔ "بیٹے! لڑکی ایک شیشے کی مانند ہوتی ہے ۔ ذرا SHOCK لگا ۔ اور ٹوٹ کر بکھر گیا ۔ تم اب سمجھدار ہو ۔ میں تمہیں پردے میں نہیں بٹھاؤں گا ۔ کہ لڑکی بے دست و پا ہوکر رہ جاتی ہے ۔ میں تمہیں سر جا بر

آزادی دوں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا۔ کہ تم بلا نہ دے سمجھے کوئی غلط قدم اُٹھالو۔"

وہ قدرے رکے۔ کچھ سوچا۔ "تمہیں ہر بات کا اختیار ہے۔ تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ مگر ایک بات یاد رکھو۔ ایک کام میری مرضی سے ہوگا۔ تمہاری زندگی کا ساتھی منتخب کرنا میرا کام ہوگا۔ تم اس سلسلے میں کوئی کوشش نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا۔ کہ تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف کردی جائیگی۔"

وہ دھیرے دھیرے سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔ "ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تمہاری مرضی اس میں ضرور شامل ہوگی۔ مگر۔ وہ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہ معلومات مجھے ہوں گی۔ تمہارا کام صرف "ہاں" یا "نا" کرنا ہوگا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہوگی۔ میں یہ قطعی نہیں چاہونگا۔ بابا جان! فلاں آدمی ہے۔ فلاں کاروبار کرتا ہے۔ یا بابا جان! اس سے ملئے۔ یہ فلاں فلاں ہے۔ کبھی نہیں۔ یہ کام میرا ہے۔ تم اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں۔"

وہ متحیر سی بیٹھی بابا جان کو بالکل نئے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ یہ شاید اس لئے تھا کہ اب وہ عمر کے اس دور میں داخل ہوگئی تھی۔ کہ جہاں بابا جان کے خدشات متوقع ہوسکتے تھے۔

اور تبھی شاید انہوں نے موقع یہ سمجھانا ضروری سمجھا تھا۔ بالکل ایک مشفق دوست کی طرح اُسے زمانے کی اُونچ نیچ سمجھائی تھی۔ وہ کم سن تھی۔ بے ماں کے تھی۔ اور بابا جان لمبا اوقات ملک سے باہر رہتے تھے اور پھر یہ باتیں اس کے ذہن میں یوں بس گئی تھیں۔

کہ واقعی ہی وہ کبھی بھولے سے بھی ایسا خیال ذہن میں نہیں لائی تھی۔
گھر سے باہر راستے میں، بازار میں۔ کچھر ہاؤس میں MIX GATHERINGS میں۔ اُس نے کبھی کسی لڑکے کی معنی خیز نظروں یا ذومعنی مسکراہٹوں کو کوئی اہمیت نہیں دی کسی کو ENCOURAGE نہیں کیا۔

جبکہ یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے۔ فطری تقاضے ہی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر لڑکی اپنے کو اہم تصور کرتی ہے۔ بھول چوک کی یہی تو عمر ہوتی ہے مگر نہیں۔ اُس نے باباجان کی بات یوں گرہ میں باندھ لی تھی۔ کہ ہر بھول چوک کے امکانی راستے بند کر دیئے تھے۔

جب زندگی کا ساتھی ہی انہوں نے چننا تھا تو پھر تردّد کی ضرورت؟۔
اور پھر وہ کسی کو پسند بھی کر لیتی۔ تو باباجان اسکی تنا دی اس سے تو کرنے سے رہے۔ پھر خواہ مخواہ کا روگ پالنے سے مطلب؟؟
مرد تو زندگی میں ایک ہی آتا ہے۔ اور وہ باباجان کے ذمے تھا۔ پھر کسی کو پسند کر کے دل کو روگ لگانے سے کیا فائدہ تھا؟؟؟۔

"اُس کی زندگی میں ایک ہی شخص آئے گا" آج اُس نے زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے سوچا۔" اور وہ باباجان کی مرضی سے ہوگا"۔
اُس نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔
جانے کیوں؟ وہ بے طرح اُداس نظر آ رہا تھا۔
"میں تمہارے بغیر اُداس ہو جاؤں گا شائی بیگم"۔ اُس کا ہاتھ ہولے سے دبائے ہوئے خوبصورت پلکیں جھپک کر اُس نے دھیرے سے کہا۔
اور وہ آہستہ سے ہاتھ چھڑاتی دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

جہاز کے ٹیک آف کا اعلان ہو گیا تھا۔ ملک سرور اور بابا بھی ان لوگوں کے پاس آ گئے تھے۔

وہ اُسے جہاز کی آخری سیڑھی تک جاتے دیکھتا رہا تھا۔ پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ آیا تھا۔

کار میں بیٹھ کر وہ واپسی کے لئے روانہ ہوا تو اُسے معلوم ہوا۔ وہ اُس کی زندگی کی عزیز ترین متاع تھی۔

۲۴

اپنے آبائی گاؤں پہنچ کر اور بابا جان کو پا کر تو وہ جیسے ہر بات ہی بھول گئی۔ صبح سویرے اُٹھتی۔ نماز پڑھتی۔ بابا جان کے ساتھ ناشتہ کرتی، فارغ ہو کر وہ اخبار دیکھتی۔ اور شائی اُس دن کے لئے پروگرام مرتب کرتی۔ پھر حسبِ پروگرام وہ بابا جان کے ساتھ چل پڑتی۔ کبھی چکور کا شکار کرنے۔ صبح سویرے نکل کر وہ شام کو ہی لوٹتے دونوں۔ کبھی گھر سے پیدل نکل کر اونچے ٹیلے پر بنی اپنی حویلی کے ساتھ ساتھ بہتے تاحدِ نظر بہتے نالے کے کنارے کنارے دور تک نکل جاتے۔ اپنے گاؤں کے چھوٹے موٹے کچے مکانات کے آگے سے گزرتے۔ اپنے سیبوں اور باداموں کے باغات میں جا نکلتے۔ واپسی دوپہر کے کھانے پر ہی ہوتی۔ دوپہر کو دونوں آرام کرتے۔ اور اس کے بعد اپنی وسیع و عریض قدیم طرز کی حویلی کے اونچائی پر بنے وسیع لان میں باپ بیٹی ڈھلتی دھوپ میں کرسیوں پر بیٹھ کر

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ۔

باباجان بالکل دوستوں کی طرح تھے حسبِ عادت اس بار بھی امریکہ کے کئی سلائیڈز ساتھ لے کر آئے تھے ۔ درجنوں تصویریں ۔ جو اُسے رات کو بیٹھ کر پروجیکٹر پر دکھاتے رہتے ۔ اُس کے لئے بیش قیمت تحالیف لائے تھے ۔ اور بہت ساری وہاں کی نئی نئی باتیں اور خبریں بھی ۔

وہ پہروں اِکٹھے رہتے ۔ اُس کے امتحان سے لے کر سیاست تک پہ بحث ہوتی رہتی ۔ اور

یوں دن ہنسی خوشی خوشی گزر رہے تھے ۔ وہ باباجان کی سنگت میں خوش تھی ۔ بہت زیادہ ۔ مگر

دِن کی مصروفیت سے فراغت کے بعد ۔ رات کی تنہائی میں ۔

جانے کیوں ؟

وہ چونک چونک اُٹھتی ۔ اُس کی نظروں میں ایک شبیہہ سی اُبھرتی ۔ لمبا قد ۔ چوڑے شانے ۔ متاثر کن پرسنیلٹی ۔ مسحور کن باتیں ۔ ہر دم بولتی پرکشش آنکھیں ۔ اور اس کا دِل یکبارگی دھڑک اُٹھتا ۔

ایسا تو اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا ۔

اتنی زیادہ دیر تک تو کبھی کسی کی صورت اُس کے ذہن میں نہیں ٹکی رہی تھی ۔ وہ گھبرا کر اس تصور سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی ۔

نیند کی سعی ۔ مگر ۔ بے سود ۔

پھر وہ پاس رکھا کوئی میگزین اُٹھا کر دیکھنے لگتی ۔ اور یوں دھیرے دھیرے

نیند کی آغوش میں جا اُترتی -

اور -

اب تو وہ دن کو بھی کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی - بابا جان سے باتیں کرتے کرتے چونک اُٹھتی - بابا جان کی موجودگی میں بے انتہا ، خوش ہوتے ہوئے بھی اُسے لگتا - اُسے کچھ کمی ہے - کس چیز کی ؟ یہ کیسی کیفیت تھی ؟ ؟ - وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی -

اور پھر تو -

جوں جوں دن گزرنے لگے - اُٹھتے بیٹھتے - چلتے پھرتے - وہی صورت نظروں کے سامنے رہنے لگی کبھی اُوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا ہوا کبھی ہاتھ جوڑے معافی مانگتا ہوا - کیا تھا یہ سب ؟ -

پھر -

آہستہ آہستہ اُسے عجیب سی خواہش ہونے لگی - وہ تنہا ہو - اور اُسی کے متعلق سوچتی جائے - کوئی مخل نہ ہو - اور تبھی وہ گھبرا کر لیٹی لیٹی بستر سے اُٹھ کھڑی ہوتی گرم گرم کمرہ چھوڑ کر باہر نکل جاتی - لمبی لمبی راہداریوں میں بلا مقصد ٹہلنے لگتی -

کہیں -

وہ نادانستگی میں - لاشعوری طور پر - اُسے پسند تو نہیں کرنے لگی تھی - ؟ -

سوچکر ہی وہ دم بخود رہ جاتی - اور بابا جان کی پسند ؟ - اُن کی چند سال پہلے کی کی گئی نصیحت ؟ - وہ اُلجھ اُلجھ جاتی -

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے - وہ سارا دن اپنے کو مصروف رکھتی -

باباجان کے ساتھ ماما کے ساتھ۔ اکیلے میں تو اسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔
ہوائیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ لال لال ٹیلے خاموش خاموش سے تھے۔
بے آب و گیاہ میدان اور ننگے پہاڑ چپ چاپ سے تھے۔
ماما اس کے لئے رات کو پہننے کے لئے نرم سا سفید بغیر آستین کا سویٹر بنتے ہوئے گزرے دنوں کا ذکر کر رہی تھیں، کچھ اس کے امتحانوں سے متعلق۔ کچھ وہاں کی کوٹھی کے دیکھ بھال سے متعلق۔ کچھ ان دنوں ادھر کی بے تحاشا سردی سے متعلق۔ اور

وہیں وہ۔ اس کا بھی ذکر کر بیٹھیں۔
وہ بری طرح چونکی۔ وہ چاہتی تھی۔ ماما اسی کی باتیں کرتی جائیں۔ کیوں؟ ۔ اسے تو جیسے وہم سا ہو گیا تھا۔ اپنے آپ سے خوفزدہ رہنے لگی تھی۔
تین ماہ ان کے پڑوس میں رہا تھا۔ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا تھا۔ پھر اس کی پسند کا بھی دعویٰ کرنے لگا تھا۔ تقریباً روز ہی اس کی صورت نظر آتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی شاید۔ کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا خیال ذہن سے نکال نہیں پا رہی تھی، کچھ دن اور اسی الجھن میں گزر گئے۔
وہ باباجان اور ان کے چند ادھیڑ عمر دوستوں کے ہمراہ شکار پر گئی تھی۔ دن بہت اچھا مصروف سا گزر گیا تھا۔ وہ اپنے کو واقعی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔
شام ہو رہی تھی۔ سورج کی کرنیں سرمئی پہاڑ سے آخری بار جھانک کر چھپ چکی تھیں۔ افق میں سرخی مائل سیاہ رنگ گھل رہے تھے۔ دن تمام ہو چکا تھا، روشنیاں سیاہیوں میں بدل رہی تھیں۔ ماحول سوگوار سا ہو رہا تھا۔

وہ سب تھک چکے تھے۔ وہیں اونچی نیچی پتھریلی زمین پر خشک جھاڑیوں کے آس پاس بیٹھ کر وہ لوگ چائے پیتے ہوئے واپسی کی تیاری میں تھے۔

وہ بھی پیالی ہونٹوں سے لگائے چپ چاپ بیٹھی سامنے تاریکیوں میں ڈوبتے سیاہ پہاڑ کو تک رہی تھی۔ یتھی۔

اچانک سُلگتے اندھیرے میں سیاہ سوٹ میں ملبوس لمبا تڑنگا انسانی ہیولہ پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا اُسے نظر آیا۔ اور اس کا۔ دل بے ترتیب ہو کر دھڑک اُٹھا۔ یہ

وہ تو نہیں تھا۔ مگر قد کاٹ۔ سیاہ سوٹ کچھ ملتے جلتے سے تھے۔ اُسے اپنی گہری مایوسی کا صاف احساس ہُوا۔

اور

اب۔ اب تو وہ اُداس رہنے لگی تھی۔ چُپ چاپ سی۔ افسردہ افسردہ سی۔ اتنے عرصے میں ایک بار بھی اُس کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں سکی تھی۔

تین ماہ پورے گزر چکے تھے۔ پچھلے الیکشن کی وجہ سے جہاں امتحان لیٹ ہوئے تھے۔ وہاں رزلٹ بھی تا حال نہیں آسکا تھا۔ ہنوز غیر معیّنہ مدت کے لئے لیٹ تھا۔

اُسے اکثر خواہش ہوتی۔ رزلٹ آتا۔ تو وہ ایم اے کرنے کے لئے واپس وہاں جاتی۔ وہی ماحول۔ وہی سب کچھ پھر ہوتا۔

اُسے شدید حیرت بھی ہوتی۔ بابا جان ایک ماہ بعد پھر امریکہ جا رہے تھے۔ دوبارہ کراچی آنے پر بابا جان کی آمد اس کے لئے وہ مکمل خوشیاں لائی۔ نا ہی اُن کی دوبارہ روانگی کے خیال سے اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک بتغیری چیز اُن کے

درمیان آرہی تھی۔ تیسرا جذبہ۔ تیسری دلچسپی۔ تیسری کشش۔ جو اُسے باباجان۔ ماما۔ گھریلو دلچسپیوں اور آس پاس کی ذمہ داریوں کی طرف۔
ڈھیل دے دے کر بھی واپس اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔
ایک اور بھی کیفیت بڑی عجیب تھی۔
اُسے انجانے میں اس کا انتظار رہتا تھا۔ اُس کی آمد کا۔ اس کے خط کا یا۔ اُس کے ٹیلیفون کا۔ اور

پھر یہ سب نہ ہوا۔ تو وہ اپنے آپ سے ہی اُلجھ پڑی۔ کیسے بلند بانگ دعوے پیار کے کرنے لگا تھا۔ "میں تمہارے بغیر اُداس ہو جاؤں گا"۔ اور پھر بالکل عین ... کے لڑکوں کی طرح پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔ وہ مشتعل سی ہو گئی۔

اور

پھر باباجان کی روانگی میں صرف تین دن رہتے تھے۔ ماما نے اُسے بتایا۔ "باباجان کے ایک دوست نے اپنے بیٹے کے لئے اس کا رشتہ طلب کیا ہے۔ خاندان بہت اعلیٰ۔ لڑکا بہت اچھا ہے۔ اُونچے عہدے پر فائز ہے۔
صاحب کہتے ہیں" خاندان دیکھا بھالا ہے۔ لڑکا شریف اور لائق ہے مجھے پسند ہے۔ شانی کی مرضی پوچھ لیں آپ"۔ "مگر ایک بات یاد رکھو۔ ایک ... میری مرضی سے ہوگا۔ تمہاری زندگی کا ساتھی منتخب کرنا میرا کام ہوگا"۔
اور اُسے اپنی گزشتہ سوچیں۔ پریشانیاں۔۔ اچانک ہی خس و خاشاک کی طرح بہتی نظر آئیں۔
بیسیوں لڑکوں کے لئے اس کا رشتہ مانگا گیا تھا۔ مگر آج تک کوئی بھی

باباجان کے معیار پر پورا نہ اترا تھا۔ یا تو وہ باباجان کو بے حد عزیز تھی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ یا پھر باباجان کا سٹینڈرڈ بہت اونچا تھا۔ اور آج تک اس پر کوئی فٹ نہیں آسکا تھا۔

بہرحال۔ یقیناً یہ جگہ ہر لحاظ سے موزوں ترین تھی۔

باباجان تو یوں بھی مختارِ کل تھے۔ اس معاملے میں۔ آج شاید وقت آن پہنچا تھا۔ اُن کے فیصلے کا۔ وہ انکار کی قادر نہ تھی۔ پھر کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی اس کی شادی تو ہونی ہی تھی۔ جب لڑکا شریف اور لائق تھا۔ خاندان دیکھا بھالا اور اچھا تھا۔ تو وہ انکار کس بل پر کرتی ؟۔

باباجان یوں بھی اُس کے مستقبل کے متعلق فکر مند رہتے۔

" چل چلاؤ کے دن میں ماما۔ شائی اپنے گھر بار کی ہو جائے، میری زندگی میں۔ تو سکون سے مر سکوں گا۔" اور بھی کئی نصیحتوں اور زمانے کی اُونچ نیچ سمجھانے کے بعد ماما نے رندھی ہوئی آواز میں اُسے باباجان کی یہ بات بھی بتا دی۔

" بیٹی۔ صاحب کی ذمہ داریوں کا خیال کرو۔ تمہاری فکر سے آدھے اِدھر۔ آدھے اُدھر۔ کاروبار کی دیکھ بھال بھی بڑی مشکل سے کر رہے ہیں۔ بیگم صاحب کو خدا جنت نصیب کرے۔ آج زندہ ہوتیں۔ تو کاہے کو صاحب یوں پریشان ہوتے۔ پھر بیٹی! جوان لڑکی کو کب تک گھر بٹھایا جا سکتا ہے۔ اصلی گھر تو اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ لڑکا اچھا خاندان اچھا ہے۔ بڑی بڑی شاہزادیوں کی قسمت کا پتہ نہیں چلتا۔ اور پھر بیٹی! شادی بیاہ کی بھی ایک خاص عمر ہوتی ہے۔ موئی تیس سال کی لڑکی کے بیاہ پر تو مجھے بھی ہنسی آتی ہے۔" شال کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ماما رو تے

رو تے سنس پڑیں۔

"باپ کے گھر میں بھی بیٹی جوان ہو جائے تو بوجھ بن جاتی ہے"۔ دکھ سے سوچتے ہوئے وہ بھی ماما کی آخری بات پر مسکرا دی۔

اس کے پیارے باباجان مشفق و ہمدرد دوست۔ ممّی کی وفات کے بعد دل پر کتنا بڑا بوجھ لئے تنہا جی رہے ہیں۔

"جیسے باباجان چاہتے ہیں ماما۔ ویسا ہی ہوگا" اس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس کی معصوم روح پر بھی تو بوجھ تھے۔ کچھ باباجان کی کہی دکھ بھری باتوں کا بوجھ تھا۔ کچھ اس کی اپنی ذات سے وابستہ باتوں کا بوجھ تھا۔

بہرحال باباجان کی روانگی سے ایک دن قبل لڑکے کی والدہ اور خالہ آئیں۔ اسے چمکتے ہیرے کی انگوٹھی پہنائی۔ اور اسی شام کی فلائیٹ سے واپس چلی گئیں۔

یوں باباجان کے ذہن پر کا گراں بار ہلکا ہو گیا۔ اور خود۔ اس کی الجھن۔ بے چینی اور اشتعال بھی مدھم پڑ گئے۔ اپنی دانست میں ایک اور بدلہ اس سے لے سکی تھی۔ شاید اس لئے۔

۲۵

باباجان امریکہ سدھار گئے تھے۔ وہ معمول کے مطابق پھر ماما کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔

چند دن تو اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ لڑکے کی والدہ اور خالہ کا آنا۔ اُسے انگوٹھی پہنانا۔ پھر اُسے اُس لڑکے کا بھی خیال آتا۔ کبھی وہ اُن لوگوں کے متعلق سوچتی۔ کبھی بابا جان کے متعلق۔

چند دن نئے واقعے اور نئے لوگوں کے خیالوں کی نذر ہو گئے۔ مگر۔ اس کے بعد پھر۔ وہی سکوت چھا گیا۔ وہی واہمے سر اُٹھانے لگے۔ وہی شبیہ آنکھوں کے سامنے اُبھرنے لگی۔ وہ اُلجھ اُلجھ گئی۔ اب ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب وہ کسی اور کی امانت تھی۔ اس سے ہٹ کر کسی اور شخص کے متعلق سوچنا اُسے گناہ لگنے لگا۔ مگر۔ پھر وہی۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ وہی وہ نظر آنے لگا۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتی۔ وہ ضرور پاگل ہو جائے گی۔ ایک طرف بابا جان کی خواہش۔ بلکہ اس خواہش میں اس کی مرضی بھی شامل کی گئی تھی۔ دوسری طرف دل کے واضح تقاضے تھے۔

وہ پھر سے اُداس اُداس۔ بلکہ چڑچڑی۔ چڑچڑی سی رہنے لگی۔ کل تو وہ ماما کی چھوٹی سی بات پہ رو دی تھی۔

"بیٹی۔ صاحب کہہ گئے تھے۔ وکیل صاحب سے جتنی رقم ضرورت پڑے لیتی رہنا۔ زیور بھاری اور اعلیٰ معیار کا ہونا چاہیے۔ باقی سب چیزیں بھی تمہاری ہی پسند سے بنوانے کا کہہ گئے ہیں۔"

وہ سن کر خاموش ہو گئی تھی۔

"اور ہاں بیٹی! دیکھو تو۔ صاحب کہہ گئے تھے۔ بندوق ریوالور وغیرہ کریم سے کہلوا کر صاف کروا کے تیل لگوا دینا۔" وہ بڑے سے سلیف کی طرف

بڑھتے ہوئے بولیں "۔ اور مجھے دیکھو صاحب کو گئے پندرہ بس دن ہو گئے آج یاد آیا"
وہ اب بھی کرسی پہ نیم دراز خاموشی سے انہیں تکتی رہی ۔

"ارے بیٹی" ۔ وہ ایک پستول نکالتے نکالتے گویا ہوئیں "یاد ہے نہ ڈی سی صاحب کا بیٹا ۔ ہمارے کتنے قریب گولی چلائی تھی ۔ اپنا تو دل اب بھی دھک دھک کرنے لگتا ہے ۔ سوچ کر ۔ یاد ہے نا بیٹی؟" ۔ وہ رُخ اسکی طرف کرتے ہوئے مسکرائیں ۔

"جی " ۔

تم کچھ چپ چپ سی ہو ۔ صاحب کے لئے اداس ہو گی" ۔ وہ پستول ہاتھ میں سے ترتیب چلی آئیں ۔

پھر اُس کا سر شفقت سے اپنے پہلو سے لگا لیا ۔ "دل تھوڑا نہ کرو بیٹی ۔ اب تو اُن کی واپسی میں بھی دن تھوڑے رہ گئے ہیں" پھر ہاتھ میں پکڑے پستول کو تکنے لگیں ۔

" اور پھر ہمارے قریب آکر بھی دھڑا دھڑ گولی چلاتے جا رہا تھا ۔ کیسا شریر تھا ۔ یاد ہے نا"

"ہاں ماما یاد ہے" ۔ وہ کچھ جھنجھلائی سی بولی ۔

"تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا نا"

"ہاں ماما نہ جانے کیوں؟ اُس کے لہجے میں بے بسی سمٹ آئی ۔

" لیکن تھا بہت نیک لڑکا" ماما اُس کے دلی جذبات سے بے خبر تھیں! اسلحہ سیف سے نکالتے نکالتے بولتی گئیں ۔

"ہو گا" اُس نے دھیرے سے کہا ۔ اور ساتھ ہی وہ آنکھوں کی نمی چھپانے کو پلکیں جھپکانے لگی ۔

اُس نے چونک کر انگلیاں گالوں پہ پھیریں۔ آنسو تو اب بھی اُس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

ایک گہری سانس لے کر وہ کرسی پہ سے اُٹھ آئی۔ انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

اُونچے اُونچے فصیل نما سرمئی پہاڑ اب بھی پورے علاقے کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ اُونچے نیچے لال لال خشک ٹیلے اس وقت بھی چپ چاپ سے تھے۔ اُونچی نیچی ناہموار پتھریلی زمین پہ جا بجا اُگی خشک جھاڑیاں البتہ زمین بوس ہو ہو کر تیز چلتی ہواؤں کا پتہ دے رہی تھیں۔ سنہری دھوپ۔ اور تیز ہوا عجیب سا امتزاج ہوتا تھا۔ ہواؤں کے جھکڑوں کے آگے سنہری چمکتی دھوپ کی کبھی ایک نہ چلی تھی۔ سردی کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے اُسے جھرجھری سی آگئی۔

"تمہارا خط ہے شانی بیٹے"۔ ماما ہاتھ میں نیلے رنگ کا لفافہ لئے اندر داخل ہوئیں۔

"میرا خط؟" لفافہ ہاتھ میں لیکر اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ کچھ حیرانگی سے بولی۔

بے حد خوبصورت۔ اجنبی ہینڈ رائٹنگ میں انگلش میں لکھا اس کا ایڈریس لفافے پہ درج تھا۔

اُسی حیرانگی سے اُس نے لفافہ چاک کیا۔ تہہ شدہ نیلے رنگ کا کاغذ کھولا۔

"میں نے تمہیں دیکھا۔ تم اچھی لگیں۔ امی سے ذکر کیا۔ وہ فوراً مان گئیں۔

مہینہ ڈیڑھ تمہارے فادر نے آزمائش میں ڈالے رکھا۔ اور آخر کار تم میری بنا دی گئیں۔
میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے ملوں۔ تمہیں دیکھوں قریب سے۔ ملو گی نا؟ ۔ ۔ ۔ ۔"
اور جانے کیا کیا لکھا تھا۔
اُس نے یقیناً اُسے دیکھا ہو گا۔ کہیں بھی۔ کالج جاتے ہوئے کسی فنکشن میں
اس کی والدہ بھی یہی کہہ رہی تھیں۔" وہ کہتا ہے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"
" مجھے خط کا جواب ضرور دینا۔ لکھو گی نا خط؟ میں تمہیں اپنے PARENTS کا
کا ایڈریس لکھ رہا ہوں تم اسی پر خط لکھنا۔ میری پوسٹنگ نئی نئی ہوئی ہے سالیانہ ہو ہمارا
خط کھو جاتے۔ تمہارا خط میرے لئے بہت قیمتی ہے۔ اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ وہ
کھو جائے۔ یا کسی اور کے ہاتھ لگ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارا اپنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
ایک گہری سانس لے کر وہ آہستہ قدم چلتی اپنے بیڈ تک آئی۔ بے مقصد
ہی بستر پہ دراز ہوتے ہوئے اُس نے کھلا خط اور لفافہ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ
رکھ لئے۔
" یہ اسے پسند کرتا تھا۔ اور وہ کسی اور کو۔ کیسا کون تھا۔ کسی بھی نقطے
پر دو دلوں کا میل نہیں ہو پا رہا تھا۔"
وہ دکھ سے سوچتی رہی۔
اُس کا خط پا کر اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ایک اجنبی مرد نے اُسے
مخاطب کیا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اُس کے سانسوں کی رفتار ضرور تیز ہو گئی تھی۔
مگر ـــ اور ـــ اور کچھ بھی نہ ہوا تھا۔
کبھی وہ سوچتی اس منگنی سے انکار کر دے۔ لیکن کہیں نہ کہیں۔ کبھی نہ کبھی

تو اس کی شادی ہونی ہی تھی ۔ کہ بقولِ کسے لڑکی لاکھ اپنے کو خود SUPPORT کرے ۔ پھر لڑکی ہوتی ہے ۔ بغیر مرد کے سہارے کے لڑکی کچھ نہیں ہوتی ۔ تو پھر پرے
مرد یا ۔ کوئی اور ۔ سبھی برابر تو تھے ۔ اس سے انکار کس امید پہ ؟ ۔
کیا یہاں انکار کر دینے سے اُسے اپنی پسند مِل جاتی ؟
اپنی پسند ۔
جو پہل کر کے یوں منہ موڑ گیا ۔ جیسے کبھی پہچان ہی نہ ہوئی ہو اُس سے ۔
پھر وہ یہ بھی شکر کرتی ۔ اُس نے اُس کی محبت پہ یقین کر کے اچھا تھا اُسے ENCOURAGE نہیں کیا تھا ۔
اور تبھی وہ سوچتی ۔ تب اُس کی FEELINGS ایسی تھیں بھی کب ؟ ۔
تب تو وہ یوں ہی سب اس کی چھیڑ چھاڑ کا ردِ عمل سمجھ رہی تھی ۔
شروع میں اُسے محض ایک لوفر اور ۔ بعد میں ایک معصوم اور بے ضرر شخص ۔ مگر ۔
ساتھ ہی وہ مانتی تھی ۔ وہ اُس کی بے پناہ پُرکشش شخصیت ۔ اور مسحور کن باتوں سے متاثر بھی ہوئی تھی ۔ مگر ۔ اس کو پیار کا نام تو نہیں دیا جا سکتا تھا ۔
وہ اُس سے ناراض بھی ہوئی تھی ۔ پھر مسلسل ناراض رہی تھی ۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ دل میں محبت کا جذبہ موجزن تھا ۔ تبھی ایسا تھا ۔

کبھی وہ سنجیدگی سے سوچتی ۔ وہاں گزارے دِنوں کا تجزیہ کرتی ۔ تو چونک اُٹھتی ۔ اُس سے متعلق ایک ایک بات کو سوچنا تو اب اُس کی عادت سی بن

گئی تھی۔ اور تبھی
ایک ایک بات۔ ایک ایک واقعہ یاد آتا۔ تو اسے قائل ہونا پڑتا۔ کہ ذہن اگرچہ انکاری تھا۔ پر دل ضرور اس کے حق میں تھا۔ پھر
وہ کلاک کی ٹن ٹن پر چونکی حسبِ عادت اس وقت بھی وہ گھنٹہ بھر سے اسی کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ اس نے پھر سر جھٹکا اور ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا خط اٹھا لیا۔

اسی طرح ہی شاید وہ اس کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی۔ "مجھے خط کا جواب ضرور دینا۔ لکھو گی نا خط؟" سرسری نظریں خط پر دوڑاتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچی۔ تو
چونک اٹھی۔ کیوں نہ وہ اسے خط کا جواب لکھ دے؟ جواب دینا اس کا اخلاقی فرض بھی تھا۔ اور اسی طرح خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلتا تو شاید۔ شاید اس کا دھیان بٹ جاتا۔ اور شاید۔ وہ اسے بھول جانے میں کامیاب ہو جاتی۔
اس نئی سوچ سے اسے کچھ تقویت ملی۔ اور خط ہاتھ میں لے کر وہ کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل کے آگے جا بیٹھی۔ پھر اس نے اسے خط کا جواب لکھ دیا۔ سادہ سا۔ چند سطروں پر مشتمل۔ یہاں بھی اس نے دیکھا۔ قلم چل رہا تھا۔ مگر الفاظ میں کوئی بھی جذبہ بھرنے سے قاصر تھا۔

لفافے میں بند کر کے اس نے اس کا ایڈریس لکھا۔ اور ٹکٹ لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے گئی۔ بیرے کو خط پوسٹ کرنے کو دیا۔ اور خود خالی خالی ذہن لئے اپنے وسیع لان میں نکل آئی۔

پرندوں کے غول کے غول اُس کے سر کے اُوپر سے گزرتے اپنے آشیانوں کی طرف بڑھے۔ تو اُسے ہوش آئی۔ شام کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اور وہ اُس کی یادوں سے چھٹکارا پانے کی نئی ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے باوجود یہ تمام وقت اُسی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ وہ بے بس سی سامنے دیکھنے لگی۔ وسیع نالے کا پانی چمکتی ریت میں لکیریں سی بناتا اپنی مخصوص سمت میں رواں دواں تھا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ واقعی بے بس ہوئی جا رہی تھی۔ نم آنکھیں جھپکتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف بڑھی۔

۲۶

اور پھر خط و کتابت کا سلسلہ چل ہی نکلا۔ وہ تو اُس کا جواب پا کر جیسے نیا جہان کے تمام خزانے پا گیا تھا۔ اُس کے خط میں کتنی بیقراریاں تڑپ رہی تھیں۔ "تمھارے بابا جان نے چھ ماہ کی مہلت مانگی ہے۔ اُنہیں کیا معلوم میں چھ سیکنڈ بھی مشکل سے گزار رہا ہوں۔ تم نے یہ نہیں لکھا میں تمہیں ملنے آؤں یا نہیں؟"

وہ بھی اُس کے خط کا جواب دے دیتی تھی۔ مگر الفاظ میں رنگینیاں نہ بھر سکی۔ کہ ایسا جذبہ ہی دل میں مفقود تھا۔ اُس نے کبھی اُس کا خط سامنے رکھ کر اُسے جواب نہیں دیا۔ بس ایک ڈیوٹی ایک اخلاقی فرض۔ بلکہ سب سے بڑھ کر اس اُمید پر کر وہ اپنے دل و دماغ میں بپا طوفان پر قابو پا سکے گی۔ اُسے خط کا جواب دیتی۔ بالکل

سیدھا سادا سا۔ چند ہی لائنوں پر مشتمل۔ وہ گلہ بھی کرتا۔ کہ اُس کا خط بہت مختصر ہوتا ہے۔ کیوں وہ اُس کا خط سامنے رکھ کر اُسے جواب نہیں دیتی؟ اس کے اکثر سوالوں کا جواب ہضم کر جاتی ہے بلکہ وہ تو اب ہر خط میں یہ بھی پوچھنے لگا تھا، کہ کیا وہ بھی اس کے لئے اتنی ہی بیقرار نہیں جتنا وہ بیقرار رہتا ہے۔؟

چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنے الفاظ میں شدت اور تڑپ نہ بھر سکی۔ کہ یہ سارے جذبے تو اب صرف کسی کی یادوں کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ اُسے تو یاد بھی نہ رہتا، کہ اس نے خط میں لکھا کیا ہے۔؟ اور وہ جواب کیا، کیا دے رہی ہے؟

کوشش کے باوجود وہ اپنی سکیم میں کامیاب نہ ہو سکی۔ کہ سانس بن بن کر تو کسی اور کا نام آ رہا تھا۔

ماحول سہما سہما سا تھا۔ ہوا رکی رکی سی۔ دور تک پھیلا پہاڑی نالہ چپ چاپ دھیمی رفتار سے رواں تھا۔ نیلگوں آکاش بھی جیسے اُداس اُداس تھا۔

حویلی کے پاس ہی رکی رکی سی رفتار سے بہتے پانی پر نظریں جمائے وہ سرمئی چٹان سے ٹکی کھڑی تھی۔

آج تو جیسے یادوں نے ہلہ بول دیا تھا۔

"اتنی سی ہو۔ شوکیس میں سجنے والی گڑیا جتنی۔ مگر پتہ ہے پھر بھی اتنے بڑے آدمی کو مار گرایا ہے۔" اپنے نازک سے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں؟ اُسے یکدم سی یاد آیا۔ ڈنر سے واپسی پر اُسے گھر لے جاتے ہوئے راستے بھر وہ بولتا گیا تھا۔

اُس نے دیکھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں منگنی کی خوبصورت انگوٹھی

چمک رہی تھی۔ وہ اُسے ہر وقت پہنے رکھتی تھی کہ ہو سکتا ہے یہی انگوٹھی اس کا دھیان بٹا کر اُس کی یادوں سے چھٹکارا دلانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اور شاید انگوٹھی دینے والے کے لئے دِل میں پسندیدگی کے جذبات سر اُٹھا سکیں۔ مگر۔ اُسے لگا۔

یہ سب ناممکن ہے۔ واقعی پیار ایک ہی بار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہو جاتا ہے۔ مگر کیا۔

اُس پر بھی یہی بات صادق نہیں آتی؟ اُس نے اچانک سوچا۔ اور پھر وہ مزید دُکھی ہو گئی۔ چٹان سے سر ٹیک کر اُس نے سنبھالا لینا چاہا۔ مگر۔ آج دل بُری طرح بے قابو ہو رہا تھا۔

"ڈ ِشنگ پرسنیلٹی والے ڈی۔سی کا کیا حال ہے؟ وہ تو بڑا بے قرار لگتا تھا۔ خط وغیرہ تو لکھتا ہوگا۔ تمہارے بغیر جانے کیسے وقت گزار رہا ہوگا بچارا؟ کہیں ماں بہن کو بھیج کر منگنی لے اُڑنے کی کوشش تو نہیں کر لی۔؟ ضرور کچھ کیا ہوگا۔ تم بتاتی نہیں ہو۔ پچھلے خط میں بھی بات گول کر گئیں۔ بلکہ وہ تو بڑا تیز تھا۔ خود ہی تو نہیں پہنچ گیا کہیں؟۔۔۔۔۔"

آج ہی صوفیہ کا خط اُسے ملا تھا۔ تمام خط اُسی کی باتوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ سنبھل نہ سکی۔ دِل بھر بھر آیا۔ اور پھر۔ پھر۔ بازو کے حلقے میں چہرہ چھپائے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

آج پھر وہ پرندوں کی پرواز کی مخصوص سرسراہٹ سے چونک اُٹھی۔ سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا۔ اُنگلیوں کی پوروں سے بہتے آنسو صاف کئے۔ اور دکھی سانس لیکر

پرندوں کے تعاقب میں دیکھنے لگی ۔

تبھی دائیں طرف قدرے فاصلے پر اونچی پہاڑی پر واقعہ طلسماتی محلوں کے شان والے پولیٹیکل ایجنٹ کے ریذیڈنس پر نظر پڑی ۔

دِنوں بعد پورے کا پورا بنگلہ آج روشنیوں سے جگمگا اُٹھا تھا ۔

اُن کی حویلی سے کوئی آدھے فرلانگ پر پی ۔ اے کے ریذیڈنسی کا گیٹ تھا ۔ گیٹ سڑک کے کنارے پر تھا ۔ اور پھر اُسی گیٹ سے سڑک کئی گولائیاں گھومتی بہت اونچی جاکر طلسماتی ریذیڈنس پر ختم ہوتی تھی ۔

وہ چھوٹی سی تھی ۔ تو بابا جان کے ساتھ ایکبار وہاں منعقد ڈنر میں گئی تھی ۔ تب اُسے لگا تھا کہ وہ کسی طلسماتی محل میں آگئی ہے ۔

وہیں پہاڑی پر اوپر لان بھی بنے تھے ۔ خوبصورت سن روم تھے ۔ وسیع و عریض کمرے تھے ۔ بالکنیاں تھیں ۔ بارہ دریاں چبوترے تھے ۔ مہمان خانے تھے ۔ وہیں اُوپر پی اے کا دفتر بھی تھا ۔ اور

یہی گولائیاں گھومتی سڑک واپس نیچے اُترتی تھی ۔ تو گیٹ عام شاہراہ پہ کھلتا تھا ۔

نیچے گیٹ سے لے کر اُوپر ریذیڈنس تک گول گول گھومتی سڑک پر کھمبوں میں لگی بتیاں جل رہی تھیں ۔ اور ریذیڈنس میں جلتی روشنیاں اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتے ستاروں سے مشابہ تھیں ۔

پچھلا پی اے تبدیل ہوکر چلا گیا تھا ۔ ریذیڈنس ویران سا نظر آنے لگا تھا ۔ آج صبح ہی نئے پی اے نے چارج لیا تھا ۔ اُسے اپنے ڈرائیور نے بتایا تھا ۔

تبھی ایکبار پھر اندھیرے میں جگنو چمکنے لگے تھے۔
اُن کی اپنی حویلی اگرچہ قدیم طرز کا نایاب نمونہ تھی۔ اُس کے بابا جان قصبے کی اہم ترین شخصیت تھے۔ تقریباً آدھا قصبہ اُن کی ملکیت تھا۔ باقی میں علاقائی لوگ اور سرکاری ملازمین۔ اُن کے گھر۔ دفتر۔ بینک۔ سکول ہسپتال وغیرہ تھے۔
خود اُن کی حویلی بھی بہت بڑے پہاڑی نالے کے کنارے اونچے ٹیلے پر واقع تک پھیلی ہوئی تھی ٹینس کورٹ تھا۔ سکواش کورٹ تھا۔ شکارگاہ تھی۔ اصطبل تھے۔ مگر جانے کیوں؟ وہ اکثر
اپنی حویلی سے شام کے پھیلتے سایوں میں جگمگ جگمگ کرتی فرلانگ بھر پرے واقعہ اونچی پہاڑی پر ایستادہ پولیٹیکل ایجنٹ کے بنگلے کو تکا کرتی۔
چند ساعتوں کے لئے وہ اپنے آنسو بھی بھول گئی۔ اور زینے تلے قدم اٹھاتی پتھروں کی بنی چند سیڑھیاں چڑھ کر اپنے لان میں آ گئی۔ وہاں سے ہوتی کچن کی طرف آ نکلی۔ وہیں ماما کک کے ساتھ لگی کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ "بیٹی! کھانا اپنے بیڈروم میں کھاؤ گی یا کھانے کمرے میں؟"۔
جب سے شامیں یخ ہونے لگی تھیں۔ وہ اکثر کھانا اپنے بیڈروم میں جلتی لکڑیوں کی گرم گرم تپش کے آگے قالین پر لگوا کر کھایا کرتی تھی۔
"جہاں بھی لگا دیں ماما"۔ وہ اداس سی بولی۔
اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کھڑکی کے کھلے پردے میں سے اُس نے دیکھا۔ بلس میں بھی چراغاں ہو رہی تھی۔ آج نئے پی اے کا ڈنر تھا بلس میں۔ اُسے یاد آیا۔ صبح ڈرائیور نے اُسے یہ بھی تو بتایا تھا۔

پھر کھانا کھاتے کھاتے وہ چونکی۔ پیلس میں زبردست دھوم دھڑکا شروع ہو گیا تھا۔ فوجی بینڈ زور شور سے بج رہا تھا۔ شاید پی اے پہنچ گیا تھا۔

ہر نئے پی اے کی آمد پر یہی کچھ ہوتا تھا۔ دھوم دھڑکا۔ شور شرابا۔ اور پُر تکلف ڈنر۔

پچھلے سال وہ بھی باباجان کے ساتھ سابقہ پی۔اے کی آمد کے اعزاز میں دیے گئے ڈنر پر گئی تھی۔

رات سنیز میں لیٹ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ناول اٹھایا۔ مگر ڈھول بجنے کا وہ شور تھا۔ کہ دو صفحے بھی نہ پڑھ سکی۔ تنگ آکر کتاب واپس رکھ دی۔ لائیٹ آف کیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کہاں؟ وہی پیلس میں زبردست باجوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ وہ پوری آنکھیں کھولے چھت کو گھورنے لگی۔ سوچوں پہ کوئی شور اثر انداز نہیں ہوا۔

وہ اطمینان سے پھر اُسی کے متعلق سوچنے لگی۔

☆ ۲۷ ☆

ڈھلتی سنہری دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا معمول کے خلاف تھمی ہوئی تھی۔ پہاڑ و میدان۔ ٹیلے اور اونچی نیچی ناہموار زمین سبھی سنہرے سنہرے نظر آرہے تھے۔

حویلی کے پاس بہتا نالہ حسبِ معمول دھیمی رفتار سے رواں دواں تھا۔ پانی کے

بیچوں بیچ بے ترتیبی سے پھیلی شفاف ریت کے ذرے چمک رہے تھے۔
دنوں بعد آج اُس نے اپنی پینٹنگ کا سامان اپنی مخصوص پسندیدہ جگہ پر
پانی کے کنارے بھیگی بھیگی ریت پر لگوایا تھا۔
کافی دیر بیٹھی وہ اپنے برش تیل سے صاف کرتی رہی۔ رنگوں کے ٹیوب
اور ٹرے جھاڑتی رہی۔ عرصہ کا جما ہوا سفید پینٹ کا ڈبہ صاف کرکے تارپین کا تیل
ملایا۔ دیر تک اُسے ہلاتی رہی۔ جب کام کے قابل ہوا تو کھڑے ہو کر سٹینڈ پر کینوس
کسا۔ ٹرے سے برش سے ایک وائیٹ کوٹ لگایا۔ نیچے جھک کر برش ٹرے میں رکھا۔
پھر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اتنے سے کام سے اس کا بازو دکھنے لگا تھا۔
"تم بہت نازک ہو"۔ دوسرے ہاتھ سے بازو سہلاتے سہلاتے جانے کہاں
سے پھر اُس کی آواز ذہن میں گونج اُٹھی۔
اور وہ پھر سے بے طرح اُداس ہوگئی۔ اُس نے ایک اور وائیٹ کوٹ لگایا۔
اور اُس کے خشک ہونے کا انتظار کرنے لگی۔
"پھر بھی اتنے بڑے آدمی کو مار گرایا ہے"۔ اُس کی دھیمی دھیمی آواز اب بھی
سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔
اس کا گلہ پھر رندھنے لگا۔
کہیں بھی تو چین لینے نہیں دے رہا تھا وہ۔ پلکیں جھپک کر وہ مختلف رنگ بنانے
میں مصروف ہوگئی۔ پھر گہرا نیلا رنگ برش پر لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔
محویت سے کینوس پر ایک کے بعد دوسرا رنگ منتقل کرنے لگی۔ اُس نے
آسمان کی نیلاہٹیں بنائیں۔ جا بجا چھائے بادل بنائے۔

"تصویر مکمل ہو گی۔ فنشنگ ٹچ لگائے گی۔ تو بہترین لینڈ سکیپ بن جائے گا۔"
وہ خالی برش بادلوں پر پھیرتے پھیرتے سوچتی گئی۔

"اسے"۔ جانی پہچانی آواز کے ساتھ ہی وہ اپنے کندھے پر بھاری سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے مڑی۔

اور پھر جیسے حیرت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ ہی تو تھا۔ بالکل وہی۔ سفید سفید ننگے پاؤں ریت میں آلودہ ہو رہے تھے۔ پینٹ کے پائنچے الٹے پیٹ کر اوپر کئے ہوئے تھے۔ مرون رنگ کی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ سیاہ کوٹ کندھے سے لٹکائے۔ ایک ہاتھ میں اتارے ہوئے بوٹ تھے۔ اور دوسرے میں ابھی ابھی اس کے مڑتے ہی آنکھوں سے دھوپ کا چشمہ اتار کر وہ اسے سر سے لے کر پاؤں تک شریر نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

"تم ہی ہونا؟" وہ اپنی خوبصورت پلکیں شرارت سے جھپک جھپک کر جیسے یقین کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ وہ ہی ہے۔

وہ سکتے کے سے عالم میں برش ہاتھ میں لئے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہو پہچانا نہیں کیا؟" وہ کوٹ کندھے پر سے اتار کر اس کے سٹینڈ سے لٹکاتے ہوئے بوٹ ریت پر پھینکتے ہوئے بولا۔

"آپ ... آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ تو دل کو طفل تسلیوں سے بہلا رہی تھی۔ یادوں سے ہی چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔ اوپر سے یہ خود آ گیا تھا۔

"تم نے آنے سے منع کر دیا تھا۔ گورنمنٹ مہربان ہو گئی۔ تمہارے نہ چاہنے کے باوجود یہاں بھیج دیا۔" وہ خوشدلی سے ہنستے ہوئے بولا۔

"اوہ"۔ تو نیا پی۔ اسے یہی تھا۔ چھم چھم چمکتے جگنوؤں والے رینڈ ٹڈنس میں رہنے والا۔

جانے کیوں؟ وہ مزید اُداس ہو گئی۔

وہ اُس کے لیے بیقرار ہو کر نہیں آیا تھا۔ پوسٹنگ ہوئی تھی یہاں۔ اس لیے آیا تھا۔

"تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا؟" اُس کے گال پہ گھر آئی بالوں کی لٹ دھیرے سے پیچھے کرتے ہوئے اُس نے پوچھا

وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنا بے تکلفانہ رویہ ابھی تک ترک نہیں کیا تھا

"میرے اچھے لگنے نہ لگنے سے کیا ہوتا ہے"۔ وہ اپنی تصویر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"اب تک ناراض ہو؟" سٹینڈ تھامے اُس کے ہاتھ پہ دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگی"

"پلیز! اب تو معاف کر دو" ہاتھ ہٹاتے ہوئے اُس نے اپنا چہرہ شانی کے ہاتھ پر ٹکا دیا۔ "مجھے تم سے محبت ہے شانی۔ بہت زیادہ۔ میں نے تمہیں اس عرصے میں کتنا یاد کیا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" وہ اس کے ہاتھ پر بے تحاشہ پیار کرتے ہوئے کہتا گیا "تم وہاں سے چلی آئیں۔ تو مجھے لگتا تھا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا"۔

وہ اپنا ہاتھ کھینچے جا رہی تھی۔ مگر وہ تو واقعی جیسے اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

سختی سے اُس کا ہاتھ پکڑے پیار پر پیار کئے جا رہا تھا۔

اُس نے برش ٹرے میں رکھ لیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر۔

اُس نے اُس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے اُسے اپنی طرف کھینچا۔ ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُس کی نظروں کی بھرپور تڑپ کی وہ تاب نہ لا سکی۔ نظریں لڑکھڑا کر جھک گئیں۔

اور تبھی اُس نے بے اختیار ہو کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ یوں بیقرار ہو کر اُسے لپٹایا۔ کہ اس کا دم رُکنے لگا۔ اُس نے اُس کے گالوں پر، آنکھوں پر اتنے بے شمار پیار کئے۔ کہ اُس کی سانسیں اُلجھنے لگیں۔

پل بھر کو تو اُسے لگا۔ اُس کی روح جنم جنم سے اُس کے اسی بے قرار پیار کی پیاسی ہے۔ ایک لمحہ کو شدید ترین خواہش ہوئی۔ وہ یوں ہی اُس کے سینے کی بیکراں وسعتوں میں کھوئی رہے۔ جہاں کوئی اور نہ ہو۔ جہاں کوئی دکھ نہ ہو۔ کوئی غم نہ ہو۔

چند لمحوں کو تو اُس نے مزاحمت بھی چھوڑ دی۔ اندازِ خود سپردگی لئے اُس کے چوڑے سینے سے لپٹی۔ اُس کی گرم گرم دہکی دہکی سانسوں میں اُس کی بے ترتیب، اُلجھی اُلجھی سانسیں مدغم ہوتی رہیں۔ مگر۔

پھر جیسے اچانک ہی اُسے ہوش آیا۔ پیار کا دعویٰ تو پہلے بھی کرتا تھا۔ ایفا کرنے کا وقت آیا۔ تو یوں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو اس دنیا میں۔ اب وہ کسی اور کی ہو گئی۔ بوجہ مجبوری اُسے یہاں آنا پڑ گیا۔

تو پھر وہی حرکتیں دہرانے لگا ۔
جیسے اُس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ جب دِل چاہا عشق جتالیا۔ جب نہ چاہا خاموش ہوکر بیٹھ رہا ۔
اب یہاں کے قیام کو رنگین بنانے کے لئے پھر ڈھیٹ بن کر چلا آیا تھا ۔
تبھی وہ
ایک جھٹکے سے اُس کے بازوؤں کا حِصار توڑ کر الگ کھڑی ہوگئی ۔
" یو فر کہیں کے"۔ وہ مشتعل ہوکر چلاّئی ۔
چند لمحے وہ حیران سا کھڑا اُسے تکتا رہا۔ اور
پھر دھیرے سے ہنس دیا۔ وہی مخصوص ہنسی۔ وہی ڈھیٹا پن لیے۔ آپا پو کا مجسمہ اُس کے سامنے ایستادہ تھا ۔
اس کے قدم پھر لڑکھڑانے لگے ۔
" آپ ۔ ۔ ! ۔ آپ چلے جائیں یہاں سے"۔ وہ بمشکل سنبھلتے ہوئے پھر بولی۔
" میں تمھیں دیکھنے آیا ہوں ۔ چلے جانے کے لیے نہیں"۔ ایک قدم جتنا وہ پھر اُس کے قریب چلا آیا ۔
" اوہ ۔ مجھے نفرت ہے آپ سے"۔ مگر اس کے لہجے میں نفرت کی بجائے بے بسی جھلک رہی تھی ۔
" اوں ہونہہ"۔ اُسے کندھوں سے تھام کر بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔ " تمہیں مجھ سے محبت ہے"۔ اس کا لہجہ بھرپور اعتماد لیئے ہوئے تھا ۔ " مجھے شدید نفرت ہے آپ سے"۔ اس کی چوری

پکڑے جانے کا ردِ عمل تھا شاید۔ وہ مشتعل ہو کر بولی تھی ۔
مگر لہجے میں لاچارگی اور آنکھوں میں نمی بھی سمٹ آئی تھی ۔
" اپنے آپ کو دہو کہ دے رہی ہو۔" اُس نے جھنجھلا کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا ۔
"چھوڑ دیں مجھے ۔چھوڑ دیں مجھے"۔ اُس کی ٹائی پکڑتے ہوئے وہ بے بسی سے سر اُس کے سینے پر پٹخنے لگی ۔

اُس نے اُسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا ۔خاموشی سے اُس کے وار سہتا رہا ۔پھر وہ چونکا ۔مزاحمت بیکار سمجھ کر وہ اُس کے بازوؤں میں لہرا سی گئی تھی۔ شاید قوتِ مزاحمت مزید باقی نہ رہی تھی ۔تھک چکی تھی ۔

"تم میری زندگی ہو ۔میری جان ہو۔ میری روح ہو۔" اُسے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے چہرہ اُس کے بالوں میں چھپا کر بیقرار ہو ہو کر وہ کہتا گیا ۔
اور
۔ ثنائی اُس کے سینے میں منہ چھپا کر بے بسی سے رو دی ۔ پھر روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی ۔ اپنی پچھلی بیقراریوں ۔بے تابیوں ۔ اُداسیوں اور بے بسیوں کا سارا غبار نکالنے پر جیسے تل گئی ۔ آنسو بہہ بہہ کر کامران کے گلے کو بھگونے لگے ۔اور وہ بے تاب ہو ہو کر اُسے لپٹاتا رہا ۔
تبھی وہ چونکا ۔
حسبِ معمول پرندوں کے غول اُن کے سروں پر سے گزرتے اپنے بسیروں کی طرف چل دیئے تھے ۔
"آؤ اب چلیں"۔ اُس کے آنسو اپنی انگلیوں پر اُٹھاتے ہوئے اُس نے

دِل نشیں مسکراہٹ سے کہا۔

"کہاں؟"

"وہاں"۔ اُس نے شرارت سے اپنے جگنوؤں کے مسکن کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دھیرے سے الگ ہو کھڑی ہوئی۔

"تو تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟"۔ اُس کے بال آہستہ سے سنوارتے ہوئے اُس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے وہ چپ سی رہ گئی کہ تڑپ تڑپ کر اُس کا رونا اُس کے کھلے پیار کی دلیل ہی تو تھا۔ مگر۔

"مجھے آپ سے پیار بھی نہیں ہے۔" باوجود کوشش ضبط کے اُس کا لہجہ شاکی اور انداز ہزاروں شکوے لئے ہوئے تھا۔

"جھوٹ نہیں بولا کرتے"۔ اُس نے آہستہ سے اپنی انگلی اس کے خوبصورت ہونٹوں پہ رکھ دی۔

"میں گھر جاؤں گی"۔ وہ ٹرے پر سے سامان سمیٹنے لگی۔

"کس کے گھر؟"۔ وہ اس کا ساتھ دیتے ہوئے پھر شوخی سے بولا۔

"اپنے گھر"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تو پھر چلو"۔ اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اُس نے قدم اپنے ریذیڈنس کی طرف بڑھائے۔

"میں اپنے گھر کی بات کر رہی تھی"۔ ہاتھ چھڑا کر وہ پھر اپنے برش تیل کے ڈبے میں رکھنے لگی۔

"تمہارا گھر وہی تو ہے"۔

"میرا گھر یہ ہے"۔ اس نے اپنی حویلی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تمہارے بابا جان کا گھر ہے"۔

"میں بابا جان سے الگ ہوں کیا؟" اُسے ہنسی آ گئی۔

"شوہر کا گھر لڑکی کا اپنا گھر ہوتا ہے بابا جان کا نہیں"۔ وہ شوخی سے بولا اور اُسے پھر اداسیوں نے آ لیا۔

سامان اکٹھا کر کے اس نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

"یہ چیزیں چھوڑ جاؤ گی؟" وہ بھی اپنا کوٹ اور بوٹ لے کر اس کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔

"نوکر آ کر لے جائے گا"۔

"کوئی اٹھا کر لے گیا تو؟"۔ وہ اطمینان سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔

کیا کر رہے ہیں؟"۔ اس کا ہاتھ ہٹا کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

عجیب تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اس کے گھر گھسا آ رہا تھا۔ کوئی دیکھ لیتا تو؟۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" وہ رک گئی۔ "کوئی دیکھ لیگا۔۔۔۔"

"مجھے کوئی نہیں دیکھتا"۔ وہ اطمینان سے کہتا چلا آ رہا تھا۔

"آپ تو ہیں ہی ڈھیٹ"۔

اور جواب میں ایک خوشگوار قہقہہ لگاتے ہوئے وہ اوپر لان میں آ گیا۔

"اے میم - تم چلیں کہاں؟" وہ اُسے برآمدے کی طرف تیز تیز چلتے دیکھ کر پیچھے سے پکار بیٹھا۔ "میرے پاؤں دھلوا دو۔ آناراستہ کیا ہیں ننگے پاؤں جاؤں گا۔" وہ وہیں ملگجے اندھیرے ہیں اطمینان سے لان چیئر پر بیٹھ گیا۔

اور وہ مزید جھنجھلا اُٹھی۔

کیا وہیں نالے ہیں نہیں دھو سکتا تھا؟ وہ پاؤں پٹختی کچن سائڈ پر گئی۔

"اسلم بابا! باہر جو صاحب لان میں بیٹھے ہیں - اُنہیں مہمان خانے ہیں لے جائیں۔ پاؤں دھوئیں گے۔"

کہتے ہی وہ کچن سے نکل گئی۔ وہ اُس کا عجیب سا مہمان تھا۔ نہ اُسے گھر سے نکل جانے کو کہہ سکتی تھی۔ نا ہی اُس کی کوئی مہمانداری کر سکتی تھی۔

پہلی بات میں دل کے تقاضے آڑے آتے تھے۔ تو دوسری میں - دنیا کی باتیں۔ اور منگنی کے بعد کسی اور کی ملکیت ہونے کا لحاظ تھا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ بے سدھ سی ہو گئی۔ جیسے میلوں بھاگ بھاگ کر آئی ہو۔

اُس نے نیچے دیکھا۔ اسلم بابا کے ساتھ وہ مہمان خانے کی طرف چلتا بہت باوقار نظر آ رہا تھا۔ وہ یوں ہی کھڑکی میں کھڑی اُسی طرف دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا۔ پیچھے اسلم بابا بھی تھے۔

"صاحب! چائے کوفی تو پیتے جائیں۔"

"اوہ - شکریہ - اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس کے کمرے کے عین نیچے سے گزرتا کوٹ پہنتے ہوئے وہ بولا۔

"صاحب! چھوٹی بی بی ناراض ہوں گی۔"
اور شائی کو اسلم بابا کی بیوقوفی پہ غصہ آ گیا۔
"وہ کیوں ناراض ہوں گی؟" وہ حسبِ عادت شرارت سے بولا تھا۔
"آپ ان کے مہمان ہیں نا"۔
"گھر والا ہوں۔ مہمان نہیں ہوں" سمجھے بابا۔"
"صاحب ...." اسلم بابا کو تو اس کی تواضع کی فکر تھی۔ اُس کی بات پر کب دھیان دے رہے تھے؟
"پھر کسی وقت سہی"۔ وہ لان کے آخری سرے کی طرف جانے لگا
"اب اجازت دو بابا"۔
"سلام صاحب"۔ اسلم بابا متاثر سے نظر آ رہے تھے۔
"سلام بابا"۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بابا کے سلام کا جواب دیا۔ اور
تیز تیز قدم اُٹھاتا سیڑھیاں اُتر کر اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

۲۸

کرنل اشفاق کے یہاں ڈنر تھا۔ وہ بھی انوائیٹڈ تھی۔ آرمی کے گنے چنے آفیسرز۔ اُن کی فیملیز کے علاوہ علاقے کے چیدہ چیدہ لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔

آج پھر وہ سب سے نمایاں تھا شخصیت میں۔ لباس میں۔ گفتگو میں۔

اور

اُس نے سوچا۔ زندگی کتنی مشکل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف منگنی کا بندھن۔ دوسری طرف دل کے تقاضے۔ وہ تو ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اُسے دل سے بھلانے کی۔ نہ بھی بھول پاتی۔ تو بھی کسی اور کی ہو کر چلی جاتی۔ بہل ہی جاتی۔ شاید۔ مگر۔ یہ

یہ تو پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ وہ تو اب بھی قطع تعلق کئے بیٹھی تھی۔ اگر وہ پیچھا چھوڑ دیتا تو۔ اُن کا آپس میں تعلق ہی کیا تھا؟۔

مگر

کرنل اشفاق کی جوان بیٹی بہانے بہانے اُس کے قریب جانے لگی۔ تو وہ چونک اُٹھی۔ وہ اپنے دل میں چبھتی پھانس کو صاف محسوس کرنے لگی۔ وہ بُری طرح جل اُٹھی تھی۔

وہ اُس کی بات کا مسکرا کر جواب دیتا۔ تو وہ واضح طور پر اپنا دل بیٹھتا محسوس کرتی۔ اگرچہ یہ کوئی قابلِ گرفت حرکت نہیں تھی۔ لڑکی آزاد ماحول کی پروردہ تھی۔ بار بار اُسے ہی متوجہ کرنے کی کوشش میں لگی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اُس کی باتوں کا جواب وہ مسکرا مسکرا کر دے رہا تھا۔ یہ ایٹی کیٹ میں شامل تھا مگر۔ پھر بھی معلوم نہیں کیوں؟ وہ واضح طور پر بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

واپسی پر اُس نے پیدل آنا تھا۔ قریب ہی تو تھا گھر۔ مگر وہ پھر اُسے اصرار کر کے بلکہ زبردستی کر کے کار میں بٹھانے لگا۔ وہ اُسی راستے سے تو جا رہا تھا۔ پھر کیوں وہ پیدل جاتی۔

"آگے بیٹھو آگے۔ پیچھے تو لوگ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتے ہیں"۔ پچھلی سیٹ کے لیے اُس کا ارادہ بھانپ کر اُسے۔

ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی اگلی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ کہ وہ پہلے بھی کبھی اُس سے نہ جیت سکی تھی۔

"سناؤ کیا حال چال ہیں ؟" گاڑی سٹارٹ کرتے ہی وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"بیگم صاحبہ! اب تو بولو نا۔ خاصی خوشامدیں کروائی ہیں اُس دن"۔ وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے پھر بولا۔

مگر وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

"یہ اندھیرے مجھ سے زیادہ اچھے ہیں ؟"۔ اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر اُس نے سٹیرنگ وہیل پر رکھ دیا۔

"اگر میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ تو آپ یقیناً میرا پیچھا چھوڑ دیں گے"۔ وہ اچانک اُس کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔

اُس نے سوچا اُسے اپنی منگنی کا ضرور بتائے گی۔ اِس طرح وہ بھی اپنی حرکتوں سے باز آجائے گا۔ اور وہ بھی شاید ایک گونہ سکون پا سکے گی۔

اور وہ زور سے قہقہہ لگا بیٹھا۔

"ویسے یہ میں پہلے سے بتا دوں۔ کہ تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں"۔ وہیل پہ رکھے اُس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میری منگنی ہو گئی ہے"۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ" ۔ اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔

"کب ؟"

"مہینہ بھر پہلے" ۔

"کس سے ؟" ۔

"بابا جان کے دوست کے بیٹے سے" ۔

"کرتا کیا ہے ؟" ۔ اس کا ہاتھ خود ہی وہیل پر سے اُٹھا کر اُس نے سیٹ پر رکھ دیا ۔

اور اپنی یہ سکیم بھی اُسے ناکام لگی ۔ اُس نے اس کا ہاتھ وہیل پر سے تو وہ بے طرح اُداس ہو گئی تھی ۔

"سی ۔ ایس ۔ پی ۔ ہے" ۔

"تم ملی ہو اُس سے ؟" ۔

"نہیں" ۔

"کبھی دیکھا ہے ؟" ۔

"نہیں" ۔

"کوئی تصویر وغیرہ ؟" ۔

"نہیں" ۔

"اور چلی ہو اُس سے شادی کرنے ؟" ۔

"ہاں" ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے ہنسی آ گئی ۔

"خوش ہو اس منگنی سے ؟" ۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے پھر پوچھا ۔

"باباجان کی خوشی میری خوشی ہے"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"لیکن تمہارا دل الگ اور باباجان کا الگ ہے"۔

"باباجان نے پوچھا تھا مجھ سے"۔

"اوہ"۔ وہ کچھ اداس سا نظر آنے لگا۔ "تم اُسے پسند کرتی ہو کیا؟"

شس نے ایک گہری نظر اس پر ڈال کر پوچھا۔

"شاید"۔

"شاید سے کیا مطلب؟ تم اپنے دل کا حال نہیں جانتیں کیا؟"۔ وہ کچھ جھنجھلایا سا بولا۔

"جانتی ہوں"۔

"پھر؟ کیا کہتا ہے؟"

شائی خاموش ہو رہی۔

اُس کا بھی موڈ آف ہو چلا تھا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

"نام تو آتا ہو گا غالباً؟" تدرے توقف کے بعد وہ سامنے دیکھتے ہوئے پھر کہنے لگا۔

"ہاں"۔ وہ اُس کے لب و لہجے پر دھیرے سے مسکرا دی۔

"مجھے بتاؤ گی؟"

"اس کا نام کامران ہے"۔

"ہوں"۔ اس نے گہری سانس لی "شکر ہے نام تو آتا ہے"۔

اُن کی حویلی قریب آ گئی تھی۔ کار کی ہیڈ لائیٹس دیکھتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

"یہیں اتار دیں۔" منگنی کے بعد وہ کچھ محتاط سی ہو گئی تھی۔ اپنے نوکروں کے سامنے کسی غیر مرد کے ساتھ گھر کے اندر آنا اُسے اچھا نہ لگا۔

"کیا بات ہے منگنی کے بعد احتیاط بہت کرنے لگی ہو۔" وہیں گاڑی روک کر اُس نے دھیرے سے کہا۔

وہ چپ رہی۔

"بہت ڈرتی ہو ۔ کامران سے"۔

شائی نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور بس۔

"پھر بھی میم صاحب منگنی ہو جانے سے تمہاری چاہے شادی۔ ان دھمکیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں۔" وہ اترنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی۔ کہ لمبی سی چوٹی سے پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے اُس نے کہا۔

"چھوڑ دیں مجھے۔ جانے کیوں؟ اپنی سکیم فیل ہوتے دیکھ کر وہ دل برداشتہ سی ہو گئی۔ آواز گلے میں رندھ گئی۔ اور۔ آنکھیں ایکبار پھر نم ہو گئیں

"اچھا جاؤ۔" جلدی جلدی سے اُس کی دونوں بھیگی بھیگی آنکھوں پہ پیار کرتے ہوئے اُس نے اُسے چھوڑ دیا۔

چند قدم پہ گیٹ اور گیٹ کھولے چوکیدار کھڑا تھا۔ اُسے زیادہ دیر روکنا مناسب نہیں تھا۔

وہ کچھ کہے بغیر گیٹ کی طرف بڑھی۔ پھر اُس نے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کب تک وہ کھڑا اُس کے گیٹ کے اندر داخل ہونے پہ گیٹ کے بند ہونے کا منتظر تھا۔

اس میٹھے درد کی ۔ پھر آج وہ کتنے خلوص سے بابا جان کی مرضی کے مطابق کامران کو
اپنا تی ۔ اُسے کوئی دُکھ ہوتا ۔ نہ کوئی فکر ۔ نہ کوئی غم ۔
اُس نے اُس کی آمد کا ماما سے بھی ذکر نہیں کیا تھا ۔ وہ تو اُس کے نام سے
گھبراتی تھی ۔ ماما تو سارا گھر ہی سر پر اُٹھا لیتیں ۔
تیاریاں شروع کر دیتیں اُس کے استقبال کی ۔ گھر کا ہونے والا اکلوتا داماد
جو ہوتا ۔

شام کے پانچ بج چکے تھے ۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا ۔ خاموشی سے
لان عبور کر کے وہ نالے کی طرف کی سیڑھیاں اُتر گئی ۔ پھر دھیرے دھیرے قدم
اُٹھاتی سوچوں میں کھوئی وہ خاصی دور نکل آئی ۔
تبھی اُس نے دیکھا ۔ جہاں نالے کا پانی کم گہرا تھا ۔ وہیں سے وہ پیدل
والے چلتے ہیں پانی میں ننگے پاؤں رکھتا چلا آ رہا تھا ۔ ایک پل کو اُس کا جی چاہا ۔
پلٹ کر تیزی سے واپس بھاگ جائے ۔ مگر اُس نے دور ہی سے اُسے دیکھ لیا تھا ۔
" ہیلو شانی جانی !" وہیں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ خوشدلی سے بولا تھا ۔
اور پھر ۔
وہ بھی رک گئی تھی ۔
" کیسی ہو ؟" اُس کے قریب پہنچتے ہی اپنا کندھے سے لٹکا کوٹ شانی
کے دونوں کندھوں پر ڈالتے ہوئے وہ مسکرا کر پوچھنے لگا ۔
" ٹھیک ہوں" ۔ وہ اُداسی سے مسکرا دی ۔
" جھوٹ کہہ رہی ہو ۔ تم تو شکل سے اُداس لگ رہی ہو" ۔ وہ پھر لو دیتی نظروں

سے اُسکی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"نہیں تو"۔ وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

"بتاؤ نا کیا بات ہے؟"۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے اپنائیت سے پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں"۔ اور ساتھ ہی اُسے لگا۔ اُس نے مزید پوچھا تو وہ رو دے گی۔

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟"۔ اُس نے مزید کہا۔

"آپ کیا بہت خاص چیز ہیں؟"۔ مسکرانے کی کوشش میں اُسکی آنکھیں چھلک گئیں۔

"خاص نہیں ہوں؟"۔

اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اُس کے خوبصورت گالوں پر لڑھک آئے۔

"شانی! تم اس منگنی سے خوش نہیں لگتیں"۔ وہ اُس کی روتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اچانک بولا۔

اور تبھی شانی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے"۔ وہ اپنی نازک انگلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری انگوٹھی بہت خوبصورت ہے"۔ اُسکی نظر اُسکی انگلی میں چمکتی انگوٹھی پر پڑ گئی۔

"منگنی کی ہے"۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

"منگنی بہت اچھا لگتا ہے۔؟"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟"۔ وہ پھر سے اُداس ہونے لگی۔

"انگوٹھی جو پہنے رکھتی ہو"۔

اور اُس نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

"آج آ رہا ہے وہ۔ بھیگی پلکیں جھپکتے ہوئے اُس نے بالکل یوں کہا۔ جیسے ایک مخلص دوست سے حالِ دل کہہ رہی ہو۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خط آیا تھا۔"

"تمہارے پاس؟"

اُس نے سر اقرار میں ہلا دیا۔ جیسے منہ سے اُس کے سامنے "ہاں" کہتے ہوئے جھجک مانع ہو۔

"تم بھی اُسے لکھتی ہو؟"۔ وہ اچانک پوچھنے لگا۔

جانے کیوں؟ وہ گھبرا سی گئی۔ اُس سے پیار تھا۔ اور اپنے پیار کا خیال تو رکھا ہی جاتا ہے۔

وہ خود ہی سمجھ گیا۔

"تم نے کیا لکھا اُسے کہ آ جائیے ملنے تمہیں؟"

"نہیں تو۔ میں نے کبھی بھی اُسے ایسا نہیں لکھا۔"

"تم خوش ہو اُس کے آنے پہ؟"

اور وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

اُس نے کئی جھوٹ بولے تھے۔ آج جانے کیوں؟ مزید جھوٹ نہ بول سکی۔ چپ ہی رہ گئی۔

"کس وقت آئے گا؟" ۔

"شاید ابھی آجاتے ۔ یا پھر آ بھی چکا ہو ۔ میں تو یہاں آنکلی ہوں"۔ وہ اداسی سے کہتی گئی ۔

"تم اُسے پہچان لوگی؟"

"وہی آج آنے والا ہے ۔ جو بھی مہمان آگیا ظاہر ہے ۔ ۔ ۔" وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی ۔

"جو بھی آگیا؟ میں بھی تو آیا ہوں"

"نام بھی بتادیگا نا"۔ وہ اُداسی سے ہنس دی ۔

"کامران ۔ کامران نام ہے نا؟"۔ وہ بغور اُسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا ۔

"آپ کے پاس اور کوئی Topic نہیں ہے؟" غیر ارادی اس کے منہ سے نکلا۔

"اوہ ۔ آؤ اُس طرف واک کریں"۔ وہ حویلی سے مخالف سمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ۔

"یہیں ٹھیک ہے"۔ وہ پہلے ہی گھر سے خاصی دور نکل آئی تھی ۔ اُسے احساس ہوا ۔

"اوہ ۔ آئی ایم سوری ۔ تمہیں اپنے "اُس کا" انتظار ہوگا"۔ اُس کے طنزیہ لہجے میں بھی اُداسی شامل ہوگئی ۔

اور شائی اُس کی اُداسی بھانپ کر پہلے سے کئی گنا زیادہ اُداس ہوگئی ۔

"جانے کیوں؟ مجھے انتظار نہیں ہے ۔ مجھے وہ ۔ ۔ ۔ میں اُس سے ۔ ۔ ۔"

چند بے ربط سے ادھورے فقروں کے ساتھ ہی اُس کے پیر الجھ کر ٹوٹ گئے ۔

"کیا بات ہے شائی! لگتا ہے تم کچھ چھپا رہی ہو ۔ کبھی لگتا ہے ۔ ۔ ۔ کچھ

تھامنے چلی ہوئے وہ اپنا ئیت سے اس کے دونوں بازو اپنی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

اور شائی اس کی قربت پاتے ہی بے اختیار ہو گئی۔

"مجھے۔ مجھے اس کا انتظار نہیں ہے..... مجھے وہ ....

مجھے ..... وہ ..... " - اور

اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ آج ضبط کے سارے بند ٹوٹ ہی تو گئے۔

وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا پیار تو اس کے سامنے موجود تھا۔ دل پر صبر و ضبط کا بارِ گراں لئے وہ تھک سی چکی تھی۔ اس کی آمد کی خبر جیسے آخری بوند تھی۔

اور

بغیر

پیمانہ چھلک ہی پڑا۔

"میں اس کا انتظار نہیں کر رہی۔ مجھے اس کا انتظار نہیں ہے ... میں

... میں ..."

اور کامران نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے میں سمو لیا۔

"میں مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔ مر جاؤں گا۔ تم میری روح ہو شائی۔ میری جان ہو۔" اس کے خوبصورت چہرے پر ان گنت پیار کرتے ہوئے اس نے اسے سینے کے ساتھ یوں جکڑ لیا تھا۔ جیسے اسے کوئی لے ہی تو جائے گا۔

اور شائی کی سانسیں ایکبار پھر الجھنے لگیں۔

مگر۔اس نے مزاحمت نہیں کی۔مچلی نہیں۔شور نہیں مچایا۔چپ چاپ اس کے سینے سے لگی ہچکیاں لیتی رہی۔

شام گہری ہو چلی تھی۔جگنوؤں کے مسکن میں پھر جھم جھم ہونے لگی تھی۔اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔گہری گھمبیرتا چہرے پہ لئے وہ اسے تک رہا تھا۔"دل کی بات بتا دیا کرتے ہیں۔بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے" وہ نرمی سے بولا۔پرکشش ہونٹوں پر پھر سے مخصوص تبسم ابھر آیا تھا۔اور آنکھیں معمول کی طرح شوخی سے چمکنے لگی تھیں۔

تبھی آنسو پونچھتے پونچھتے اسے احساس ہوا۔یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔آدھا راز تو اسے بتا ہی دیا تھا۔یہ تو وہ سمجھ ہی گیا تھا۔کہ وہ اپنے منگیتر کی منتظر نہیں ہے۔کہیں باقی کا آدھا بھی وہ جان تو نہیں گیا تھا۔وہ سمجھ تو نہیں گیا تھا۔کہ اس کا پیار وہ ہی ہے؟ اس نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

دل نشیں مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے وہ اسے تک رہا تھا۔

"آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔تمہارا مہمان آچکا ہوگا۔ہو سکتا ہے تمہارے پہنچتے پہنچتے وہ چلا بھی گیا ہو"۔اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا۔اور وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

آ بھی گیا ہوگا۔چلا بھی گیا ہوگا۔کیا کہہ رہا تھا وہ؟ "خدا حافظ"۔اسے لان کی سیڑھیوں تک پہنچاتے ہوئے اس نے دھیرے سے اپنے ہونٹ اس کے نازک سے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بار بار بھول جاتے ہیں ۔ کہ میری منگنی ہو چکی ہے" ۔ اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا کر اس نے ہولے سے کہا ۔

"دیکھا جائے گا" ۔ اس نے خوشدلی سے جواب دیا ۔ "ٹا ٹا" ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ اپنے ریذیڈنس کے راستے پر ہو لیا ۔

۲۹

اُسے کل سے بخار آ رہا تھا ۔ ٹھنڈ لگ گئی تھی شاید ۔ ماما نے ڈاکٹر بلوا کر دکھایا تھا ۔ اور دوائیاں اس نے شروع کر لی تھیں ۔ مگر طبیعت ابھی تک سنبھلی نہیں تھی ۔

ماما کی زبانی آنٹی افتخار کو معلوم ہوا ۔ تو دوڑی چلی آئیں ۔ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھیں اس کا سر دباتی رہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ کئی گھریلو نسخے بتاتی گئیں ۔ ڈاکٹروں کی تیز اور گرم دواؤں کی منفی بھی کرتی رہیں ۔ پھر چائے پیتے پیتے باتوں کا رخ اڑوس پڑوس کی طرف جا نکلا ۔

"کل کرنل اشفاق کی بیگم نے نئے پی اے کو چائے پر گھر بلایا تھا" ۔ وہ جیسے رازداری سے کہنے لگیں ۔

"کرنل اشفاق صاحب کی بیگم نے؟" ماما کچھ حیران سی بولیں ۔

اور رشائی کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اُٹھا ۔ نائلہ پھر بیٹھی بیٹھی رہ گئی

"ہاں ۔ ہاں ۔ صرف پی اے صاحب کو ہی بلایا تھا ۔ میں اچانک چلی گئی

تھی، مجھے تو لگتا ہے کچھ بیٹی کا چکر ہے۔ لڑکی بنی سنوری چائے پیش کر رہی تھی۔" اور ثنائی کو ایک بار پھر دل بیٹھتا سا محسوس ہوا۔ باتوں کا رخ اب دوسری طرف پھر گیا تھا مگر ثنائی کے دکھوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ جھنجھلا اٹھی۔ کیا ہو گیا تھا اسے ہمہ۔ شادی کسی اور سے ہونے والی تھی۔ دل کسی اور کو چاہتا تھا پھر وہ کرنل کی بیٹی کو لفٹ دینے بھی لگا تھا۔ تو وہ کس منہ سے گلہ کر سکتی تھی۔

مگر

"وہ جو اس سے پیار کا دعویٰ کرتا تھا؟ دل نے کہا۔

"کچھ بھی ہو وہ اس کا پابند تو نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی اور سے وابستہ تھی۔ کسی کو لفٹ دینا چاہے کچھ بھی کرتا۔ اس کا پابند تو نہیں تھا نا۔" دماغ نے دلیل پیش کیا۔ "مگر اس سے پیار جو جتاتا تھا۔" دل نے پھر احتجاج کیا۔

"کرتا ہو گا پیار۔ مگر پابند نہ ہونے کی صورت میں جو ادھر ادھر دل لگی کر رہا تھا۔ اس میں اس کا قصور بھی تو نہیں تھا۔" پھر ذہن نے کہا۔

آنٹی افتخار جا چکی تھیں۔

ماما نے رات کا کھانا اس کے بستر کے پاس ہی میز پہ لگوا دیا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے پشت ٹکاتے ہوئے سیدھی بیٹھ گئی۔ ماما نے اس کے سامنے نیپکن بچھایا۔ پھر خالی پلیٹ اس کے سامنے رکھی۔ اور اسکی پسندیدہ ڈش میں سے مٹر گوشت اس کی پلیٹ میں ڈالا۔

اس نے نوالہ توڑا۔

"بائی! ہے ماما سالن میں!" وہ چڑچڑے پن سے بولی۔

"یہ نہ کھاؤ بھنا گوشت کھالو"۔ پلیٹ اُس کے سامنے سے ہٹا کر دوسری خالی پلیٹ رکھنے لگیں۔

"نہیں کھاؤں گی"۔ وہ مزید چڑچڑا کر ان کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ تو کھاؤ ثنائی بیٹے۔ خالی پیٹ دوا کھانا ٹھیک نہیں۔ اور تم نے ڈھیر ساری دوائیں کھانی ہیں ابھی"۔ وہ شفقت سے بولیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دنوں سے ثنائی کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ جانے کیا وجہ تھی؟

"دوائیں بھی نہیں کھاؤں گی"۔ اُسکی آواز بھرائی

"ارے کیسی بچوں والی بات کر رہی ہو۔ دوائی کیوں نہیں کھاؤ گی"۔

"بس کہہ جو دیا"۔ اور آنسو ڈھلک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔

ماما حیران ہو کر اس کا مُنہ تکنے لگیں۔

کیا ہو گیا تھا اُسے؟ حساس تو وہ شروع سے تھی۔ مگر یوں ہر بات میں نقص نکالنا اُس کی بالکل عادت نہیں تھی۔ نوکر تو اُس کے گُن گاتے تھے۔ اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اُس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔

"اچھا لو۔ پڈنگ کھالو تھوڑی سی"۔ وہ بے حد پیار سے بولیں"۔ خالی پیٹ دوا کھانا ٹھیک نہیں"۔

"نہیں کھاؤں گی ماما۔ نہیں کھاؤں گی"۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔

ماما نے میز پرے ہٹا دی۔ اور پھر اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کا سر سہلاتے

ہوئے دیر تک تسلیاں دیتی رہی۔

تھوڑی دیر قبل آنمیس زمینس کے لائبریری انچارج نے اُسے فون پر بتایا تھا۔ کہ کل ہی ڈھیر ساری نئی کتابیں لائبریری میں آئی ہیں۔ وہ چاہے تو آکر دیکھ لے۔

وہ یوں ہی ہر بار نیا سٹاک آنے پر اُسے مطلع کیا کرتا تھا۔ دِل کے بہلانے کو اچھا خیال تھا۔

وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ گلابی گرم کپڑوں پر نرم نرم سویٹر پہن کر اُس نے اوپر سے چمڑے کا براؤن خوبصورت کوٹ پہنا۔ براؤن چمڑے کے بوٹ پہنے۔ سر پر سفید فر کا سکارف لپیٹتے ہوئے وہ نیچے اُتری تو دہلیز میں اُسے ماما مِل گئیں۔

" ماما میں میس جا رہی ہوں۔ لائبریری میں نئی کتابیں آئی ہیں۔" ساتھ ہی وہ لاؤن کراس کرنے لگی۔

پتھروں کی مختصر سی سیڑھیاں اُترتی وہ نالے میں اُتری۔ پھر دائیں طرف مڑی۔ اور میس کی طرف جاتی کچی سڑک پر ہو لی۔

عرصہ بعد آسمان پر بادل چھائے نظر آئے تھے۔ ہوا بہت تیز تھی۔ سردی شدید تر تھی۔ جا بجا اگے بادام کے درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے۔ ارد گرد تاحدِ نظر اُونچے اُونچے سرمئی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ سر بالی سے مبرا۔ کوئی اکا دکا درخت بھی نہیں تھا ان پر۔ لال لال جھنڈے تڑے تیلوں پر اگی خودرو جھاڑیاں البتہ ہوا کی زد میں تھیں۔

اونچی نیچی سرخ پتھریلی سڑک پر دھیرے دھیرے قدم رکھتی وہ اونچائی چڑھ رہی تھی۔ میس نظر آنے لگا تھا۔ پرانی خوبصورت عمارت تھی۔ لان بھی تھا۔ جا بجا لگے

پھولوں کے پودے بھی تھے - چند ایک سدا بہار درخت بھی نظر آ رہے تھے - جان توڑ محنت کے بعد ہی یہاں کوئی سبزہ یا پھول نظر آتا تھا -

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا - کوئی نظر نہ آیا - وہ سیدھی لائبریری کی طرف بڑھی - دروازے پر ہی ایک چوکیدار نے مؤدب طریق سے سلام کرتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھولا - سبھی اُسے جانتے تھے - اور بہت عزت دیتے تھے -

دھیرے سے شکریہ کہتی وہ دبے قدموں آگے بڑھ گئی -

کھڑکی پٹ سے کھل گئی - یخ بستہ ہوا کا جھونکا اندر آیا - اُسے جھرجھری سی آ گئی - اُٹھ کر اُس نے کھڑکی کے کھلے پٹ بند کرتے ہوئے چٹخنی لگا دی -

واپس کرسی پر بیٹھنے لگا تھا - کہ نظریں دوسرے پورشن میں کتابوں کے شیلف میں کچھ تلاش کرتی شانی پر پڑ گئیں - خوبصورت مسکان خود بخود ہی اُس کے ہونٹوں پہ پھیل گئی - واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پھر سے TIME کا تازہ پرچہ دیکھنا شروع کیا - مگر

اب کے میز پہ نہیں رکھا - وہیں گود میں رکھ کر سر میز پہ ٹیکتے ہوئے نیچے گود میں رکھے کھلے میگزین کو تکتا گیا - مگر -

اب - اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی - کہاں سے اُس نے چھوڑا تھا اور اب کہاں سے پڑھنا تھا ؟ --

اُس نے کنکھیوں سے دیکھا - شانی دھیرے دھیرے مختلف شیلفوں پر نظریں دوڑاتی اِس پورشن میں آ رہی تھی -

وہ اب بھی کھڑکی کے قریب بیٹھا ایک بڑی سی الماری کی اوٹ میں تھا -

آہستہ آہستہ چلتی وہ اُسی الماری کے پاس آ گئی۔ پھر اُسی چھوٹے سے کیبن نما جگہ میں آ گئی۔ اُسکی پیٹھ اب بھی کامران کی طرف تھی۔

وہ سر جھکائے جھکائے ہنس دیا۔

وہ بالکل اُس کے قریب آ گئی۔ اب بھی اُس کی طرف پیٹھ تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ سر اُٹھاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

اور وہ یوں اُچھلی۔ جیسے اُسکی دھیمی آواز نہیں کوئی دھماکہ ہوا ہو۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو؟" رسالہ میز پر رکھتے ہوئے اُس نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کھینچ لیا۔

"میں کیوں ڈروں گی"۔ وہ ہاتھ چھڑانے لگی۔ اُس کا لہجہ روکھا روکھا سا تھا۔

"چلو میں ڈروں گا۔ مگر ہاتھ نہ کھینچو"۔ وہ گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

وہ سپاٹ سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

وہ کچھ حیران سا ہوا۔ آج وہ چند دن قبل کی طرح نرمی نہیں برت رہی تھی۔

"بیٹھو نا"۔ وہ اُسے اپنے دائیں طرف والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں کتابیں دیکھنے آئی ہوں"۔ اس کا ہاتھ اب بھی اُس کی گرفت میں میز پر رکھا ہوا تھا۔

"بڑی دیر سے دیکھ رہی ہو۔ اب بیٹھو۔"

تو وہ اُسے خاصی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے پھر خیال آیا۔ آجکل وہ کرنل اشفاق کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ نائیلہ کو لفٹ دے رہا تھا۔

"نہیں بیٹھوں گی"۔ اُس نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا۔

"دیکھو تمہارا ہی ہاتھ دکھے گا۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"نہیں ہو کیا گیا ہے؟"۔

"کچھ بھی ہوا ہے۔ آپ کو کیا؟"

اور اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کچھ گڑبڑ تھی۔

"تمہارا اُدہ" آیا تھا اس دن؟"۔

"نہیں"۔ اس نے مزاحمت چھوڑ دی تھی۔ مگر لہجہ آپ بھی روکھا روکھا تھا۔

"خیر تم باہر نہیں نکلیں۔ میں دو دن متواتر وہاں گیا تھا"

"مجھے بخار ہو گیا تھا"۔

"اوہ۔ کب؟"۔

"جب آپ کرن کے گھر چائے پر گئے تھے" وہ اپنا طنزیہ لہجہ چھپا نہ سکی۔

"اوہ"۔ وہ بہت کچھ سمجھ گیا۔

جانے کیوں؟ اُسے بڑا مزہ آیا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"۔

"ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں"

"بڑی عقلمند ہوتی جا رہی ہو"۔ وہ شرارت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں"۔ اس نے پھر ہاتھ کھینچا۔ لہجے میں تیزی بھی آگئی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا"

"آپ بیک وقت کتنی لڑکیوں کو دھوکہ دیتے ہیں؟"۔

"تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ میں ایسا کرتا ہوں تو؟"۔

" مجھے کیا آپ کچھ بھی کریں" وہ مزید تیزی سے بولی۔

اور وہ مزید محظوظ ہوا۔

" اچھا چھوڑو یہ بات۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے اُس کا خط آیا ہے۔ پھر؟"

" روز آتا ہے"۔ وہ بھی شاید اُسے جلانے کا سوچ رہی تھی۔

" بڑا پیار کرتا ہے تم سے"

" شاید"۔

" تمہیں اچھا لگتا ہے وہ؟"

" آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"۔ وہ تلخی سے بولی۔

" میں تمہیں اتنا ڈھیر سارا پیار کرتا ہوں۔ اتنا حق تو مجھے پہنچتا ہے نا کہ یہ بات پوچھوں تم سے"۔

" آپ پیار کرتے ہیں؟"

" اور کیا جھک مارتا ہوں"

" اور وہاں کیا کرتے ہیں جا کر؟"۔

" کہاں؟"۔ وہ انجان بن گیا۔

" یہی باتیں آجکل وہاں بھی دہراتے ہوں گے"

" نہیں میڈم۔ بالکل نہیں۔ یہ باتیں تم سے۔ اور صرف تم سے ہوتی ہیں"۔ وہ اُسکی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنساتے ہوئے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

وہ خاموش ہو رہی ۔

"اچھا میں آئندہ وہاں نہیں جاؤں گا ۔ اب تو خوش ؟"

وہ اب بھی نظریں جھکاتے میز پر رکھے TIME کے پرچے کو تکتی رہی ۔

"تمہیں یہ بتایا کس نے ہے ۔؟" ۔ وہ پھر بولا ۔

"بس بتا دیا کسی نے" ۔

" اور تم ناراض ہو گئیں "

"میں کیوں ناراض ہوں گی ۔؟"

" یہ اپنے دل سے پوچھ لو" ۔ وہ آرام سے بولا ۔

اور اس کی پلکیں گرنے اور اٹھنے لگیں ۔

"میں ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ "

" چلو چھوڑو ۔ کچھ اپنے "اس" کے متعلق بتاؤ" ۔

" آپ کو اس سے اتنی دلچسپی کیوں ہے ؟ ۔"

" مجھے ؟ ۔ اس سے دلچسپی ہے ؟" ۔

" پھر کیوں پوچھتے رہتے ہیں ؟" ۔

" بس یوں ہی ۔ اندازہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خوش قسمت تمہیں کتنا اچھا لگتا ہے"

"مجھے اچھا نہیں لگتا "

"کیوں ؟"

"بس ؟"

" پھر منگنی کیوں کی تھی ؟ "

"باباجان کی خواہش تھی"۔

"اور خود تمہاری مرضی؟ تم تو ہو ہی اتنی سی - مائیکرو سکوپک سی چیز۔ باباجان نے اہمیت ہی نہیں دی ہوگی"

اور اس کے لب و لہجے پر اسے ہنسی آگئی -

" LET'S STOP IT - آؤ اپنی باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ تم تو کیا اپنی باتیں بتاؤ گی۔ میں اپنی سناتا ہوں -

رات میں نے خواب دیکھا تھا ---" وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا -

اور وہ مسکراتے ہوئے اس دلچسپ آدمی کو دیکھنے لگی -

"خواب میں ایک لڑکی دیکھی تھی - بے حد خوبصورت - نازک نازک سی -"

اور ثنائی کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں -

"اب تم خواب میں آئی لڑکی پر ناراض ہونے لگیں"۔

"میں کیوں ناراض ہوں گی"۔ وہ آہستہ سے بولی -

"اچھا سنو۔ پھر وہ میرے قریب آئی - بہت زیادہ - تھی بھی بہت پیاری -" وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا -"سو میں نے اُسے سینے سے لگا لیا -"

"آپ تو ہیں ہی بدمعاش" تلخی سے کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا لیا -

اور کامران زور زور سے قہقہے لگانے لگا -

اُسے بھی ہنسی آنے لگی - ہاتھ بڑھا کر اُس نے میز پر سے میگزین اُٹھا لیا -

"یہ میرا ہے"۔ کامران نے جھپٹ سے چھین لیا۔ رسالہ لے کر پھر اُس نے بولنا

تو تھا نہیں۔

"لائبریری کا ہے"۔ اس نے واپس چھین لیا۔

اور پھر ٹھیک کا بیرا دونوں کے لئے گرم گرم کوفی لے آیا۔ ساتھ میں چکن سینڈوچ بھی

"مزہ آگیا"۔ بیرے کے جاتے ہی کامران نے کہا۔

وہ کوئی توجہ دیئے بنا رسالے پر نظریں جمائے رہی۔

اس نے ایک پیالی شائی کے آگے رکھ دی۔ اور سینڈوچ اٹھا کر اس کے منہ تک لے گیا۔

"یہ کھاؤ۔"

"نہیں"۔

"کیوں؟"

"بس"

"بھئی ہوا کیا ہے؟ اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو آج؟"۔

وہ خاموشی سے رسالہ دیکھتی رہی۔

"پتہ ہے یہ بیرا باہر جا کر کیا کہے گا؟"۔

وہ اب بھی خاموش رہی۔

"کہ دونوں بیٹھے اندر۔۔۔"

"میں بتا دوں گی اُسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نائیلہ اشفاق نہیں۔ شائی فصیح احمد ہوں"۔ اس کی بات کاٹتے ہوئے اب بھی رسالے پر نظریں جمائے اس نے پھولے پھولے منہ کے ساتھ کہا۔ "اوہ"۔ اس نے شرارت سے آنکھیں نچائیں ——

"STOP NOW ۱۲ - یہ تو بتاؤ تمہارا رزلٹ آیا یا نہیں ؟"

"آجائے گا آپ کو کیوں فکر ہے ۔"

"فکر مجھے نہیں تو اور کس کو ہو گی ؟" - اُس نے خالی کپ میز پر رکھ دیا -
پھر آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا - کتابوں کے شیلفوں پہ سرسری نظریں ڈالتا ہوا
دوسرے سرے تک گیا - چند کتابیں اُٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا - اور
پھر دھیرے دھیرے چلتا واپس اُسکی پشت پہ آکر کھڑا ہو گیا - دونوں بازو
اُسکی گردن کے گرد حمائل کئے - اور ہولے سے اپنے ہونٹ اُسکی گردن پر رکھ دیئے -
کتنا بولڈ تھا وہ - وہ دیکھ رہی تھی - جب سے وہ یہاں پوسٹ ہو کر آیا تھا -
بہت ہی بے تکلف اور دلیر ہو گیا تھا - پیار تو اُسے یوں کرتا جیسے عین اس کا
جائز حق ہو -

یوں بے تکلفی سے اُسے لپٹا لینا - جیسے ... جیسے وہ کسمسا کر رہ گئی - رسالہ
میز پہ رکھ دیا - اور اُس کے بازوؤں کا حصار کھولنے لگی - مگر
حصار ڈھیلا کرنے کی بجائے وہ - اُس کے چہرے پہ جھک آیا - پل میں ہی
بیسیوں پیار کر ڈالے - اور
جانے کیا تھا ؟

وہ - جب بھی اُسے پیار کرنے لگتا - وہ اپنا سدھ بدھ کھو بیٹھتی - بابا جان
کی خواہش کے خلاف دل بغاوت پہ اُتر آتا - اور اپنے سامنے کھڑے پیار سے بے
اختیار لپٹ جانے کو جی چاہتا - اور پھر -
تبھی کوئی حل نہ پاکر - اُسکی بے بسی گہری ہو جاتی - اور ہر بار ہی وہ باوجود

کوشش ضبط کے ۔ اُس کے سامنے ہی آنسو گرانے پر مجبور ہو جاتی ۔
"چھوڑ دیں مجھے"۔ بھرّائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی ۔
کرسی پیچھے کھسکائی ۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے ۔
"پلیز..."۔ وہ اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا ۔
"پلیز..." اُس نے دوبارہ کہا ۔ اور
پیار کے تمام تر جذبوں کے ساتھ اُسے سینے سے لپٹا لیا ۔
"شانی! کیوں دور دور رہتی ہو ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا ۔
مجھے اور نہ آزماؤ ..."۔ اُسکی آنکھوں پہ بے تحاشا پیار کرتے ہوئے وہ کہتا
گیا ۔ اور
وہ ۔ اُسکے سینے سے لگی بے بسی سے روتی رہی ۔
"شانی! میں اچھا نہیں لگتا۔" اُسکی روتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے
پوچھا ۔ اور
اُس کے سینے سے سر ٹکاتے ہوئے وہ مزید رو دی ۔
"تمہیں وہ ، مجھ سے زیادہ اچھا لگتا ہے؟"۔
"مجھے وہ اچھا نہیں لگتا"۔ وہ روتے ہوئے بولی ۔
"پھر کون اچھا لگتا ہے؟"۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے اُسکی روتی آنکھوں میں
دیکھ رہا تھا ۔
"نہیں معلوم ..."۔ اُسکی نظریں لڑکھڑا کر جھک گئیں ۔
اور کامران خوبصورتی سے ہنس دیا ۔ کسی طرح اقرار کرتی ہی نہیں تھی ۔ اُس کے

پیار کا۔

"بتاؤ نا کون اچھا لگتا ہے؟" ۔ انداز خود سپردگی لیے اس کے سینے سے لپٹی تھی۔ مگر۔ اقرار پھر بھی نہیں کر رہی تھی۔

"کوئی بھی نہیں" ۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کوئی تو ہے" ۔ وہ شرارت سے بولا۔

"نہیں ہے" ۔ وہ پھر بولی۔

"اوہ۔ خود تو سو ہی پاگل۔ مجھے بھی کر دا کے چھوڑو گی" ۔ وہ اسے کندھے سے تھامے باہر نکل آیا۔

"آؤ بیٹھو" ۔ وہ کار کی طرف بڑھا۔

"نہیں" ۔

"پھر؟" ۔

"پیدل جاؤں گی" ۔

"آؤ پلیز" ۔

"نہیں" ۔

اور وہ اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ اس عرصے میں خاصی چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ پہلے سے کمزور بھی۔ کملائی ہوئی سی تھی — اور بدمزاج بھی —

وہ پیدل ہی چل پڑی۔ اور وہ بیٹھ کر جانے لگا۔

"بہت ضدی ہو" ۔ اس کے قریب سے دھیمی رفتار سے گزرتے ہوئے اس نے کھڑکی میں سے سر باہر ڈال کر کہا۔

اچھی ہوں"۔

اور وہ دلنشین مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے آگے بڑھ گیا۔

وہ واقعی ضدی تھی۔ وہ وہاں ہی اُسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ سمجھتا تھا سب۔ مگر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ اور یہاں۔ یہاں تو کتنی کتنی دیر اندازِ خودسپردگی لیئے اُس کے سینے سے لگی روتی رہتی تھی سینے سے لگی لگی۔ اپنے منگیتر سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھی۔ اور سینے سے لگی لگی سی۔ جب وہ اُس سے پوچھتا۔

"پھر کون اچھا لگتا ہے؟"۔ وہ یکدم ہی مکر جاتی تھی۔

دُہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

معصوم سی گڑیا۔ کارینہ ایسی نازک سمجھتی تھی۔ وہ بھی اسکی طرح ناداں ہے۔ کچھ نہیں سمجھتا جیسے۔

وہ اُسے ہی تو پیار کرتی تھی۔ اُس کے سینے سے لگ کر اپنی ریشمی سانسوں سے اس کے بے تحاشہ پیار کا اقرار کرتی تھی۔ مگر زبان سے پھر بھی۔ انکار کر رہی تھی۔ اپنے سیاہ کوٹ کے بٹن میں اٹکے اُس کے سنہرے حسین بال کو چھوتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

وہ اُسی کا تو پیار تھی۔ اُسی کی تو تھی۔

۳۰

کئی دنوں سے آسمان کو گھیرے میں لئے بادل آج برس ہی پڑے تھے۔ تمام رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ صبح بھی دل کھول کر پانی برستا رہا تھا۔ مگر اس وقت بوندا باندی ختم ہو گئی تھی۔ ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی۔ پہاڑوں اور درختوں پر جمی مدتوں کی گرد پانی سے دھل کر بہہ گئی تھی۔ مگر منجمد کر دینے والی ہوا اب بھی چل رہی تھی۔ سیاہ بادل اب بھی ہر سو چھائے نظر آ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ گھوڑا دوڑاتا وہ نالے کے راستے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ کچھ اس امید پر کہ شاید شائی بھی اپنی حویلی کے سامنے ہٹنگ کرتی یا واک کرتی اسے مل جائے۔ سردی شدید تر تھی۔ بادل ابھی اور برسا چاہتے تھے۔ اور سامنے کے پہاڑوں پر آج رات برف پڑنی یقینی تھی۔

سرمئی پہاڑوں کو گھیرے میں لئے سیاہ گھٹاؤں پر نظریں جمائے وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ تبھی

وہ چونکا۔ اس کے پیچھے ہی کوئی گھوڑا دوڑاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے پیچھے رخ موڑا۔ اوہ۔ یہ نبیلہ اشفاق تھی۔ کچھ دیر قبل وہ اسے رائیڈنگ کلب میں نظر آئی تھی۔ اس نے بھی شاید اسے دیکھا ہوگا۔ جبھی اس وقت اسے آ لیا تھا۔

"ہیلو کامران صاحب"۔ وہ گھوڑے کی رفتار کم کرتی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ہیلو"۔ اُس نے بھی جواب دیا۔

"کیسے ہیں آپ کامران صاحب؟"۔ وہ پھر بولی۔

"ٹھیک۔ اللہ کا فضل ہے"۔ اُس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"بہت دنوں سے آپ ہمارے یہاں نہیں آئے"۔ وہ شاکی لہجے میں بولی۔

"مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے۔۔۔۔"اُس نے مسکراتے ہوئے کہا

"آپ چاہیں تو اتنا وقت ضرور نکال سکتے ہیں"۔ اُس نے کامران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کرنل صاحب کیسے ہیں؟" اُس نے بات کا رخ موڑنے کی خاطر کہا۔

"اچھے ہیں۔ ہر وقت آپ کی تعریف کرتے رہتے ہیں"۔

"نوازش ہے اُن کی۔ ورنہ میں اس قابل کہاں؟"

"آپ کس قابل ہیں یہ مجھ سے پوچھیے۔۔۔۔"۔

"آپ بتائیے نہیں۔۔۔۔ دراصل۔۔ شام کو میں اپنی منگیتر کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اس لیے وقت کم ہی ملتا ہے کہیں آنے جانے کا"۔ اُس نے بتا دینا ضروری سمجھا

"آپ کی منگیتر؟ ۔آپ کی منگنی ہوئی ہے کیا؟"۔ اُس نے بمشکل پوچھا۔

"جی میری منگنی ہو چکی ہے۔ ابھی ابھی کوئی ڈیڑھ ماہ ہوا ہے"۔

"آپ کی منگیتر یہاں ہوتی ہیں۔؟" اُس نے مزید پوچھا۔

"جی۔ وہ سامنے تو دائیں جانب حویلی ہے۔۔۔۔۔"

"وہ تو فصیح احمد صاحب کی ہے۔۔۔"۔

"اُنھی کی بیٹی سے میری منگنی ہوئی ہے"۔ وہ اطمینان سے بولا۔

شائستہ سے؟"

"ہوں۔۔۔" وہ مسحور سا بولا۔

"لیکن آپ فرنٹیئر سائیڈ کے ہیں۔ یہاں اتنی دور۔۔۔۔"

"دل قریب ہونے چاہئیں۔ فاصلوں سے کیا ہوتا ہے۔۔"

"اوہ"۔ وہ جل ہی تو گئی۔

"منگنی آپ کی پسند پہ ہوئی ہے"

"جی۔ میں نے اُسے دیکھا۔ مجھے اچھی لگی۔ امّی سے ذکر کیا۔ انہوں نے ڈیڈ سے۔ وہ فوراً مان گئے۔ کسی زمانے میں ڈیڈ یہاں ایکسین رہ چکے تھے۔ وہ انکل یفصح احمد کو جانتے تھے اچھی طرح۔ پھر مہینہ بھر کے سوچ بچار کے بعد انکل نے بھی ہاں کر دی۔ اور امی اور خالہ نے آکر اُسے انگوٹھی پہنا دی اس طرح سے ہم دونوں کی منگنی ہو گئی۔۔۔" اُس کے بار بار کے سوالوں پہ اُس نے مختصراً اُسے ساری بات بتا دی۔

تبھی چٹان کے پیچھے سے نکل کر سامنے آتے ہوئے اُس نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پہ شائی اپنی حویلی کے سامنے حسب سابق سٹینڈ لگائے تصویر بنانے میں مصروف تھی۔

"آج خیریت نہیں"۔ اُس نے سوچا۔ اور آہستہ سے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا۔

"آپ نے اچانک رُخ کیوں بدل لیا؟"۔ کامران کی تقلید میں نائیلہ نے بھی گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔

"مجھے جلدی ہے۔ یہ کنارا نسبتاً نزدیک پڑتا ہے"۔ اُس نے بات بنائی۔

اُس کی ہمراہی میں وہ شانی کے اتنے قریب سے نہ گزر سکا۔ مگر۔ اس کے باوجود ۔ دم لینے کو شانی رکی۔ تو پیچھے دیکھتے ہوئے نالے کے دوسرے کنارے پر اُن دونوں کو گھوڑوں پر سوار آہستہ آہستہ چلتے دیکھا۔ پھر اس کے حواس جیسے کام کرنا ہی بھول گئے۔ ایک ٹک دونوں کو جاتے دیکھتی رہی۔

تو دونوں اکٹھے رائیڈنگ کرنے نکلے تھے؟ ۔ اب شاید اُسے گھر بھی لیکر جا رہا تھا۔ وہ پاگل سی ہو اٹھی۔ اُسے کچھ ہی نہ آئی۔ وہ کیا کرے؟ چیزیں وہیں چھوڑ چھاڑ وہ سیڑھیاں چڑھ کر لان میں پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ کیسی تھی اس کی قسمت؟ کچھ عرصہ سے مسلسل دکھ اور درد سہتی آ رہی تھی۔ ایسا دکھ اور ایسا درد۔ کہ کسی سے کہہ بھی نہ سکتی تھی۔

کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر وہ بے بسی سے رو پڑی۔ جب اُن دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ تو پھر وہ اُسے نائیلہ کے ساتھ دیکھ کر کیوں اتنی بے چین ہوتی تھی؟ ۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنی بے بسی پر۔ اپنی بے کسی پر۔

" تمہارا فون ہے شانی بیٹی " ۔ ماما نے اُوپر سے آواز دی۔

" اچھا " ۔

اچھا تھا ماما قریب نہیں آئیں۔

ورنہ وہ تو بُری طرح رو رہی تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی وہ اُوپر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

" شانی بول رہی ہوں " ۔ اُس کی آواز سے صاف پتہ چلتا تھا۔ کہ وہ روتی رہی ہے۔

"کیا کر رہی تھیں۔؟" ۔ وہ بلا تمہید بولا۔

"کچھ بھی کر رہی تھی آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے" ۔ وہ اپنا غصہ چھپا نہ سکی۔

"مارے گئے"۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اپنے قریب پہنچے ابھی ابھی پہنچے نعیم سے بولا۔

"میں ۔ ۔ ۔ میں تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔"

"شٹ اپ" ۔ وہ مزید دل لگی برداشت نہ کر سکی۔

"تم نے شاید مجھے نائیلا اشفاق کے ساتھ دیکھ لیا ہے ۔ ۔ ۔"

" اوہ میں کہتی ہوں بند کر دیں آپ" ۔ اُس کی آواز بھر بھرا آئی۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے شانی ۔ ۔ ۔"

"آپ صفائی کیوں دے رہے ہیں؟" ۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"اس لئے کہ مجھے تم سے پیار ہے ۔ ۔ ۔"

"اوہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پلیز شانی ناراض مت ہونا۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ میں مر جاؤں گا"۔

"اللہ کرے آپ مر جائیں ۔ یا پھر ۔ ۔ میں ہی مر جاؤں" ۔ اُس نے روتے ہوئے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"چلو چھٹی ہوئی"۔ وہ ٹیلیفون بند کرتے ہوئے قالین پر لکڑیوں کی آگ کے سامنے پڑے نرم نرم گدے پر نعیم کے پاس آ کر آلتی پالتی مارتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"یار منگنی کے بعد بے حیا بہت ہو گئے ہو"۔ نعیم ایک بڑی سی لکڑی آگ میں جھونکتے ہوئے بولا۔

"مثلاً؟"

"ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے۔ مرجاؤں کا ناراض مت ہونا"

کامران ڈھٹائی سے ہنس دیا۔

"ویسے کامران! اُسے اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ تم ہی اس کے منگیتر ہو۔ کچھ زیادتی سی لگتی ہے۔ پھر اُسے جا جا کر ملتے بھی ہو۔ کرنل کی بیٹی کے ساتھ پھر کر اُسے جلاتے بھی ہو"۔ ۔ ۔

"ابھی اُسے معلوم نہ ہو سکا۔ کہ میں ہی اُس کا منگیتر ہوں۔ ایک اتفاق ہی ہے۔ شروع میں میں نے اُس کی ماما کے پوچھنے پر اپنا نام نعیم بتایا تاکہ میں اُوٹ پٹانگ حرکتیں کروں تو وہ مجھے پہچان نہ سکیں۔ بعد میں ہماری کوئی خاص بات چیت ہی نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے۔ ایسا کوئی موقعہ نہیں آیا تھا۔ کہ میں اُس سے اپنا تعارف کرواتا۔ انکل نصیح احمد بھی نہیں تھے۔ تب شاید وہیں اُسے میرے نام کا پتہ چل جاتا۔ منگنی کے بعد اس کے پہلے ہی خط سے مجھے اندازہ ہُوا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکی ہے۔ اپنے باقی خطوں میں میں نے بھی پھر اسے کچھ نہیں بتایا۔ یہاں آیا اُسے ملا تو وہ مجھے الگ اور کامران کو الگ آدمی سمجھ رہی تھی۔

مجھے بھی مزہ آنے لگا۔ اُسے اپنا منگیتر پسند نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی اقرار نہیں کرتی کہ مجھے پیار کرتی ہے۔ مکرتی رہتی ہے چھپاتی رہتی ہے اس دو راہے سے گھبرا کر رونے لگ جاتی ہے۔ شروع میں تو مجھے مزہ آرہا تھا۔ مگر اب اب اُس پر ترس آتا ہے۔ وہ اس عرصے میں بالکل مرجھا کر رہ گئی ہے۔ چڑچڑی اور بدمزاج بھی ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں اُسے سب کچھ بتا دوں۔ ۔ ویسے وہ مجھ پر رعب بھی

ڈانتی ہے۔ مجھ سے باتیں بھی خوب کرتی ہے۔ ہر بات بتا دیتی ہے جیسے مجھ پر مکمل اعتماد ہو۔
کرنل اشفاق کی بیٹی کا طعنہ بھی دیتی ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ۔۔۔۔"
اُسے اچانک یاد آیا۔ وہ اُس کے سینے سے لپٹی روتی بھی رہتی ہے۔ مگر پھر
چُپ کر گیا۔ ہر بات بتانے کی تھوڑی ہوتی ہے؟
"کچھ چھپانے لگے ہو۔" نعیم اچانک بولا۔
"نہیں۔ سنو۔ مزہ یہ ہے کہ۔ پھر مکرتی بھی ہے۔
میں لاکھ کوشش کرتا ہوں۔ منہ سے اقرار نہیں کرتی"۔
"تم کیوں ضرور چاہتے ہو کہ وہ مُنہ سے بھی کہدے کہ تم اُسے اچھے لگتے ہو"۔
"بس دِل کرتا ہے کہ وہ اپنے مُنہ سے کہدے۔ آخر میں بھی تو اُسے کہتا ہوں کہ
مجھے اُس سے پیار ہے۔ بلکہ۔۔۔"
"بہت کچھ کرتے ہو گے بچو۔ مجھ سے چھپا رہے ہو"۔
اور کامران نے زور سے قہقہہ لگا لیا۔
"مجھے کیا بدمعاش سمجھ لیا ہے؟"۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ "وفر تو ہونا"۔
"ہاں"۔ اس نے ہنستے ہوئے اقرار کیا۔
اور نعیم نے گہری سانس لی۔
"WILL POWER ہونی چاہیئے"۔
اور کامران کے فلک شگاف قہقہے بلند ہو اُٹھے۔
"ویسے کل میری خیر نہیں ہے"۔
"کیوں؟"۔

"اس نے مجھے رنگے ہاتھوں نائیلہ اشفاق کے ساتھ رائیڈنگ کرتے دیکھ لیا ہے"۔

"اسے پتہ ہی نہیں کہ تم اس کے منگیتر ہو اور ڈرتے ہو اسی سے"۔

"منگیتر تو بقول اس کے اس کا بھی کوئی اور ہے۔ میں نہیں۔ پھر وہ کیوں جلتی ہے۔ مجھے کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر؟"۔

"بھئی مجھے تو کھانا کھلاؤ۔ تم دونوں کا رشتہ خاصا پیچیدہ اور باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔" وہ ہاتھ اونچا کر کے کال بیل پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

۳۱

کامران نے اسے پھر منا لیا تھا۔ منت سماجت کر کے۔ ہاتھ جوڑ کر۔ اور۔ آخر میں بے تحاشہ پیار کر کے وہ اس کی توقع کے مطابق اس بار بہت ناراض تھی۔ مگر اس نے جب بھی اس سے ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ اس سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑتا۔ نظریں چراتے ہوئے چپ کر جاتی۔ جب بھی اس نے براہ راست نائیلہ کا نام لیا۔ کہ وہ اس کی وجہ سے ناراض ہے۔ وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ مگر

اس کے باوجود وہ اسی وجہ سے روٹھی ہوئی تھی۔

جب اس نے قسمیں اٹھائیں۔ ہاتھ جوڑے۔ وعدہ کیا کہ وہ پھر اس سے نہیں ملے گا۔ تو اس کی خوبصورت آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اور یہ کشش

ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اُس نے اُس سے اس کے منگیتر کا حال بھی پوچھا تھا۔ جسے وہ اس بار سرے سے سننے کو ہی تیار نہ تھی۔

"بتاؤ وہ اچھا نہیں لگتا کیا؟" - اُس نے اُسے سینے سے لپٹائے لپٹائے دھیرے سے پوچھا تھا۔

"نہیں" - اُس نے صاف کہا تھا۔

"پھر؟ کون اچھا لگتا ہے؟" - اُس نے غور سے اُسکی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کوئی بھی نہیں" - اُس کی نظریں پھر لڑکھڑا گئی تھیں۔

مگر وہ جھنجلا اُٹھا تھا۔

"تم چھپاتی کیوں ہو؟" - وہ اچانک بازوؤں کا حصار توڑ کر اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سختی سے بولا تھا۔

"میں - میں کیا چھپاتی ہوں؟" - وہ اُس کے رویے پر بوکھلا سی گئی۔

"تم اپنی منگنی سے خوش کیوں نہیں ہو؟" -

"میری مرضی" - وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

"تم پھر چھپا رہی ہو - تمہاری مرضی کے پیچھے کچھ ہے" -

"کچھ بھی تو نہیں" - وہ آہستہ سے اُسکے ہاتھ ہٹاتے ہوئے نیچے دیکھنے لگی۔

"میں چلتا ہوں - تم بور کرتی ہو" - اُس نے

واقعی جانے کے لئے قدم بڑھا دیے تھے - کوٹ کا کالر ٹھیک کرتے

کرتے اُس نے پھر مڑ کر دیکھا۔
موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں لئے وہ نادم سی کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی، وہ اُلٹے قدموں واپس چلا آیا۔ ایک نظر سنجیدگی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر بے اختیار اُسے سینے سے لگا لیا۔

"شانی! میری زندگی۔ کہدو کہ تم مجھے ہی پیار کرتی ہو۔ کہدو ورنہ میں ۔ میں مر جاؤں گا۔"

اُسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتے ہوئے وہ کہتا گیا۔ اور شانی انداز خود سپردگی لئے اُس کے سینے سے لگی اِتنا روئی۔ اتنا روئی۔ کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔

مگر۔ اُس کے باوجود۔ اُس کے پیار کا اقرار اُس کی زبان پر نہ آسکا۔ کیونکہ ابھی وہ تو کسی اور کی پابند تھی چند ماہ اور تھے۔ اور پھر اُس نے ہمیشہ کے لیے اپنے منگیتر کا ہو جانا تھا جس سے اُسے کوئی دلچسپی تھی نہ کوئی دِلی تعلق، کچھ عرصہ قبل اس سے ہمدردی اور ترس کے جذبات ضرور تھے۔ مگر جب سے اپنا پیار سامنے پایا تھا وہ جذبات یکسر ہی ختم ہو گئے تھے۔ اب تو وہ اُس سے وابستگی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ اب تو۔ اب تو وہ اُس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اپنا پیار جو مل گیا تھا۔

مگر
یہ کیسا پیار تھا۔؟ چند روزہ۔ پھر ہمیشہ کے لیئے وہ اُس سے جُدا ہونے والی تھی۔
وہ اچانک ہی پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"شانی اتنا روتی کیوں ہو؟" کامران گھبرا سا گیا۔

اور وہ دل کھول کر رو دی۔ کافی دیر بعد آنسو تھمتے تو وہ خود اس سے الگ ہو گئی۔ اور پھر جانے کیوں؟ بغیر کچھ کہے سنے چند قدم چل کر اپنی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
وہ حیران سا وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو دھیرے سے سر جھٹکتا وہ اپنی راہ ہو لیا تھا۔
وہ عجیب سے دوراہے پر کھڑی تھی۔ بستر پر پڑ کر وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی، آج تو جیسے مزید صبر کا یارا نہ رہا تھا۔ اپنے دُکھ اُسے لاتعداد ہی نظر آنے لگے۔ کیا ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ؟ اپنا منگیتر اُسے ناپسند تھا۔ اس سے قربت کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس سے پیار تھا۔ اُس کے ساتھ وابستگی ناممکن تھی۔ اور اس پر نا بابا اشفاق کا وجود اُس کے لئے سوہانِ روح بنتا جا رہا تھا۔ اُسے اپنا آپ مظلوم سا نظر آنے لگا۔

رات اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ماما کے اصرار کے باوجود سر منہ ڈھانپ کر بستر میں پڑی رہی تھی۔ تمام رات سوچ سوچ کر سر دکھنے لگا تھا۔ وقفے وقفے سے رو رو کر آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔
بابا جان بھی اگلے ہفتے وطن پہنچنے والے تھے۔ پھر یقیناً شادی کا ذکر چھیڑا جانا تھا۔ اور اس ذکر سے ہی اُس کی روح فنا ہوتی تھی۔
کیا وہ بابا جان کے آگے اس منگنی سے انکار کر دے؟ کیا وہ مان جائیں گے؟؟
شاید۔ مان جائیں۔ وہ اُسے بے تحاشہ چاہتے تھے۔ اُس کی خواہش کبھی رد نہ کرتے تھے۔ مگر۔ کیا وہ یہ نہ کہیں گے منگنی سے پہلے اس نے کیوں حامی بھری تھی؟ اس کی مرضی پوچھی تو گئی تھی۔

تو کیا منگنی کی لاج رکھتے رکھتے وہ اپنی زندگی اور اُسکی ساری خوشیاں بھینٹ چڑھا دیگی۔؟ کیا ساری زندگی یوں ہی روتے سسکتے بتا دیگی؟۔ یوں ہی آہیں بھرتے بھرتے سلگتے سلگتے؟۔

وہ گھبرا کر بستر میں اُٹھ بیٹھی۔ کیسا مہنگا سودا تھا۔ "نہیں"۔ اُس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔" وہ اتنے ڈھیر سارے دُکھ نہ سہہ سکے گی۔ وہ باباجان سے کہہ دیگی۔ وہ اس منگنی پہ پابند نہیں رہ سکتی۔ وہ مان جائیں گے یقیناً۔ اُنہیں اس سے بے حد پیار تھا۔ وہ یقیناً اس کی آئندہ زندگی دکھی اور سسکتے گزرتی برداشت نہ کر پائیں گے"۔ یہ سوچ کر اُسے ایک گونہ سکون ملا۔

پھر صبح کی سپیدی نمودار ہوئی۔ تو اُٹھ کر وہ باتھ روم گئی۔ وضو کیا۔ اور نماز پڑھ کر خلوص دل سے اپنے دلی اور ذہنی سکون کی دعا مانگی۔

آج دن بھر ذہن کچھ ہلکا ہلکا سا تھا۔ گو کہ وقفے وقفے سے اپنا ارادہ ڈانواں ڈول ہوتا محسوس ہوتا۔ مگر پھر بھی دل کو سمجھا بجھا کر دلیر بننے کی کوشش کرتی۔

صبح کی بوندا باندی کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا۔ ہر چیز نکھری نکھری۔ دھلی دھلی نظر آ رہی تھی۔ لال لال ٹیلے ستھرے ستھرے نظر آ رہے تھے۔ اور اونچے سرمئی پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ نالے میں پانی کی سطح اونچی ہو گئی تھی۔ اور سرخی مائل گدلا سا پانی اپنے مخصوص شور کے ساتھ رواں دواں تھا۔ حویلی کے آخری حدود میں نالے کے کنارے بڑے سے پتھر پہ بیٹھی وہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

"بوجھو کون ہے۔؟" جانی پہچانی آواز کے ساتھ ہی اُسے اپنی آنکھوں پہ،

ہکے ہاتھ کا مس محسوس ہوا۔

اس کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ اور ساتھ ہی آج دن بھر کا ڈوبتا ابھرتا ارادہ کانپ کانپ گیا۔

کوئی جواب نہ پاکر وہ دھم سے اس کے بالکل قریب اسی پتھر پہ بیٹھ گیا۔ شائی نے دیکھا اُس کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تازہ اور خوبصورت سا گلاب تھے۔

"کل تمہاری سالگرہ ہے نا"۔ وہ پھول اُسے تھماتے ہوئے بولا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"۔ اُسے شدید حیرت کے ساتھ ساتھ یاد آیا۔ کل واقعی اُسکی سالگرہ تھی۔

جسے بابا جان ہر سال جب وطن میں موجود ہوتے تو ضرور مناتے تھے۔ اس بار بابا جان بھی موجود نہ تھے۔ اور۔ خود اُسے بھی اس مرتبہ پہلی بار یاد تک نہ آیا تھا۔ کہ کل اسکی برتھ ڈے ہے۔

"بس معلوم ہو گیا"۔ وہ امپورٹڈ چاکلیٹس اور سوئیٹس کا بڑا سا بن اُس کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"کھولو۔ دونوں کھائیں گے"۔ وہ اپنائیت سے بولا۔

"بتائیں نا کیسے پتہ چلا؟"۔ بن کا ڈھکنا کھولتے کھولتے اس نے پھر پوچھا۔

"پھر ناراض ہو جاؤ گی"۔ ۔

اور وہ دھیرے سے مسکرا دی

"بتا دوں؟" وہ خود ہی بولا

"بتا دیں"۔

"نائیلہ اشفاق نے فون پر بتایا تھا"۔ اُسے واقعی کل شام اُسی نے بتایا تھا۔ اور شانی نے بلا سوچے سمجھے چوکلٹس اور سوئٹس کا ٹن اور پھول واپس وہیں پتھر پر رکھ دیئے۔

اُس کے خوبصورت چہرے پر کرب و اُداسی کے آثار صاف نمایاں تھے۔

پھر جانے کیا ہُوا؟ وہ پتھر پر سے اُٹھ آئی۔ وہ حیران سا ہُوا۔ آج وہ اپنی جلبی چُھپا نہیں رہی تھی۔

"کہاں ؟"۔ اُس نے جھٹ سے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر واپس بٹھا لیا۔

"چھوڑ دیں مجھے"۔ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے غصے سے بولی۔

مگر اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا بازو اُس کی کمر میں ڈال کر اُسے مزید اپنے قریب کر لیا۔

"نہیں چھوڑوں گا"۔

"آپ یہ سب اُس کے ساتھ کیا کریں"۔

"کیا اُس کے ساتھ کروں ؟"۔ اُسے ہنسی آ گئی۔

"بس جانے دیں مجھے"۔

"لیکن کیوں ؟"

"بس آپ وہاں جائیں"۔

"کہاں ؟"

"اُسی نائیلہ کے پاس"۔

"تمہارے پاس کیوں نہیں؟" ۔

" آپ کو وہ اچھی لگتی ہے نا"۔ وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی ۔

"جلتی ہو اُس سے؟"۔ وہ اُس کے کان میں بولا۔

"میں کیوں جلوں گی؟"۔ وہ حسبِ سابق بولی ۔

"اچھا نہیں جلتیں ۔ تو یہ کھاؤ"۔ وہ چوکلیٹ اس کے منہ میں دیتے ہوئے خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"یہ سب اُسے دے دیں"۔ وہ شاکی انداز میں بولی ۔

"اُسے اور دے دوں گا ۔ یہ تمہارے لئے ہے"۔

اور وہ پھر آپے سے باہر ہونے لگی ۔

"چھوڑ دیں مجھے"۔ اُس کے بازو کی گرفت سے اپنی کمر چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تیزی سے بولی ۔

"اچھا پلیز! معاف کر دو"۔ اُس نے شرارت سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے"۔

اُس نے فون بجا تھا۔ اب رنگ ہو تو یہ پتہ تو نہیں چلتا نا کہ کس کا فون ہے؟ میرے اُٹھاتے ہی اُس نے کہا "میں نے صرف یہی کہا تھا کہ کل اُسکی سالگرہ ہے"۔ اُس نے ساری بات سچ سچ بتا دی ۔

شائی کا پارہ واپس گرنے لگا ۔

"وہ بھی ناراض ہے آجکل"۔ اُس نے پھر شہہ دی ۔

اور وہ دانتوں سے اسکا دہی کمر میں حمائیل ہاتھ کاٹ کر اپنے کو چھڑاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

"ہائے رے"۔ اس نے اس کی کاٹی ہوئی جگہ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"بڑی مریض ہو بالکل"۔

"اچھی ہوں"۔

"اس میں کیا شک ہے"۔ وہ اسے اپنے ہاتھ پر اس کے دانتوں کے نشان دکھاتے ہوئے بولا۔

وہ چپ سی ہو کر ایک قدم آگے بڑھ گئی۔

"یہ لے لو"۔ اس نے بستر پر رکھے پھولوں اور سوئیٹس کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں"۔ وہ پھولے پھولے منہ کے ساتھ بولی۔

"اگر تم نے یہ چیزیں نہ لیں۔ تو تم سے کبھی نہیں بولوں گا"۔ اس نے دو ہی قدم بڑھائے تھے۔ کہ وہ پیچھے سے آتا ہوا بولا۔

جانے کیوں؟ وہ وہیں ٹھٹھک کر رک گئی۔ سر جھکائے بلا مقصد لوٹ کی ٹو سے گیلی ریت میں لکیریں بنانے لگی۔

"کسی کی دی ہوئی چیز واپس نہیں کیا کرتے"۔ اس نے اداسی سے مزید کہا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

"آپ۔۔۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"۔ پہلی بار اس کے منہ سے نکلا۔

"نائیلہ اشتفاق کے یہاں۔ اس نے بلایا تھا"۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر بھرے سے بولا۔

"اوہ"۔ اسے اپنا دل بیٹھتا سا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں اچانک ہی بے شمار آنسو اکٹھے ہو گئے۔

وہ دو قدم مزید آگے بڑھا۔ پھر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اُس کے آنسو اُسکی کمزوری تھے۔ وہ پھر پلٹ آیا۔ "اُس نے فون پر مجھے بلایا تھا کہتی تھی دو منٹ کی بات ہے سُن جاؤ"۔

"آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ نہیں جائیں گے"۔ وہ اچانک اُس کے بازوؤں میں سماتے ہوئے اپنا سر اُس کے سینے سے ٹکتے ہوئے رو پڑی۔

"اچھا۔ اچھا"۔ اُس کا سر سہلاتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ "تمہیں وہ اچھی نہیں لگتی؟"۔

"نہیں"۔

"اپنا وہ اچھا لگتا ہے؟"۔

"نہیں"۔ وہ مزید تڑپ کر رونے لگی۔ "مجھے اِن لوگوں سے بچا لیں۔ پلیز"۔

اُسے وہ اپنا بہت قریبی ہمدرد نظر آیا۔

"پھر منگنی کیوں کی تھی؟" وہ دھیرے سے بولا۔

"وہ بابا جان کی خواہش تھی۔ مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بچا لیں پلیز۔ پلیز۔۔۔" اُس کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔

"رو و نہیں پلیز۔۔۔" اُس نے اپنی انگلیوں سے اُس کے آنسو خشک کئے۔ "مسکرا دو"۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے مسکرانا پڑا۔ وہ بھی خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"نابیلہ بُری لگتی ہے۔ اپنا منگیتر بُرا لگتا ہے۔ میں بُرا لگتا ہوں۔ پھر اچھا کون لگتا ہے؟"۔ وہ اُس کی روتی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

اور شائی کوئی جواب دیئے بنا سر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"بتاؤ نا" ۔ اُس نے اصرار کیا۔

مگر اب کے اُس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ اُبھر آئی ۔ اور اُس نے سر واپس اُس کے سینے سے ٹکا لیا۔

اس انوکھے اندازِ اقرار پر کامران نے اُسے مزید بھینچ لیا ۔ بے تحاشہ پیار کر لیا۔ شام کے سائے غالب آ رہے تھے ۔ سامنے بلندی پر اُس کے ریذیڈنس میں پھر سے جگنو ٹمٹمانے لگے تھے۔

"میں اچھا لگتا ہوں نا" ۔ اُس کا چہرہ اُوپر اُٹھاتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے" اُس نے مسکرا کر بات ٹالنا چاہی۔

"بڑی چالاک ہو" ۔ اپنا کوٹ اُتارتے ہوئے اُس نے اُس کے کندھوں پر ڈال دیا۔

"اب بتاؤ" ۔ کامران کی نظریں اب بھی اُس کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"سردی لگ رہی ہے" ۔ اُس نے پھر کہا۔

"ہوں" ۔ اُس نے گہری سانس لی ۔ پھر اپنی مردانہ رنگ کی جرسی بھی اُتار دی۔

کوٹ اُس کے کندھوں سے ہٹایا ۔ اور اُس کے نرم نرم گلابی سویٹر پر اپنا بڑا سا سویٹر اُسے پہنا دیا ۔ پھر کوٹ دوبارہ اُس کے کندھوں پہ ڈال دیا۔

"اب؟"

"اب بھی لگ رہی ہے"۔ وہ شرارت سے بولی۔
"یہ لو"۔ وہ اپنی قمیض کے گلے کے بٹن کھولنے لگا۔
"نہیں"۔ وہ پہلی بار کھلکھلا کر ہنس دی۔
"کیوں؟ سردی ختم؟" وہ گلے کے بٹن یوں ہی کھلے چھوڑتے ہوئے بولا۔
"ہاں"۔ وہ پھر ہنس دی۔
"بتاؤ پھر"۔
"آپ کو سردی لگ رہی ہوگی"۔ اسے پھر بات بتانا پڑی۔
"اوہ۔ اندازے سے زیادہ ہوشیار ہو"۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے اسے سینے سے بھینچ لیا۔
اور پھر۔ اسے پیار کر لیا۔ اتنا کہ۔ اس پورے عرصے میں نہیں کر پایا تھا۔
پھر گلاب اور سویٹس اسے تھمائے۔ اور کندھوں سے سہارا دیتے ہوئے حویلی کی سیڑھیوں تک لے آیا۔
"آپ یہ لے لیں"۔ وہ اپنے کندھوں سے اس کا کوٹ اتار کر اسے دینے لگی۔
کامران نے کوٹ اس کے ہاتھوں سے لے کر پہن لیا۔
"یہ بھی"۔ وہ اس کا سویٹر بھی اتارنے لگی۔
"نہیں میم"۔ یہ تمہارے پاس رہے گا۔ آسمان بتا رہا ہے۔ رات برف ضرور پڑے گی۔ یقیناً تمہیں سردی زیادہ لگے گی"۔ وہ خوشدلی سے کہتا گیا۔
اور وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔
"خدا حافظ"۔ اس نے اس کا رخ لیتے ہاتھ ہوئے سے دبایا۔

"خدا حافظ"۔ وہ دھیرے سے بولی۔
اور وہ اُسے سیڑھیاں چڑھتے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔

۳۲

آج پھر سارا دن برف گرتی رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس آرم چیئر پر بیٹھی پہروں آسمان سے روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف کو تکتی رہی تھی۔
آج بھی وہ سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ذہن اپنے پیار کے اقرار اور منگنی سے انکار کے اُدھیڑ بن میں مصروف کسی حتمی فیصلے پر پہنچا چاہتا تھا۔
موسم کی طرح وہ بھی گم سم۔ اُداس اُداس تھی۔ کھانا بھی اُس نے برائے نام ہی کھایا۔ وہ پھر کو بستر میں گھس کر بیٹھی وہ سامنے کی کھڑکی سے برف باری دیکھتی رہی تھی۔ پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔
اُٹھی تو چھ بج رہے تھے۔ آج میجر اعظم کے یہاں ڈنر تھا۔ ہیڈ کوارٹر سے ڈی، آئی، جی معہ اپنی بیگم کے تشریف لائے تھے اور کرنل اشفاق کے بعد آج میجر اعظم نے اُنہیں گھر پر انوائٹ کیا ہوا تھا۔ علاقے کے چند لوگ بھی بلائے گئے تھے۔
وہ بھی انوائٹیڈ تھی۔ مگر۔ کچھ یوں بھی اُس کی طبیعت اچاٹ سی تھی۔ کچھ موسم بھی ایسا تھا۔ گو برف گرنی بند ہوگئی تھی۔ مگر۔ پھر۔ اُسے جانا ہی پڑا۔
میجر اعظم نے ٹھیک وقت پر فون کرکے اُسے یاد دہانی کرائی تھی۔ وہ بادلِ

نخواستہ تیار ہونے لگی۔

مینوی بلیو گرم قیمتی لباس پہنا۔ سفید فر کا کوٹ اور ہمرنگ خوبصورت ٹوپی پہنی۔ سفید سوکس اور نیوی بلیو سمارٹ سے شوز پہنے۔ لباس پر پویڈی کلون کی سپرے کی اور نیچے اتر کر لوبی میں آگئی۔ کار میں بیٹھ کر اس نے ٹائم دیکھا مقررہ وقت سے کچھ اوپر ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی چلادی۔ برف کی وجہ سے آگے بڑھنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ بہرحال پہنچتے پہنچتے کچھ اور بھی دیر ہو گئی۔

وہ متاسف سی اندر داخل ہوئی۔ سب کی توصیفی نظروں سے بچتی وہ ایک خالی صوفے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں جلتی لکڑیوں کی خوشگوار گرمی پھیل رہی تھی۔

اس نے ایک سرسری نظر مہمانوں پر ڈالی۔ عورتیں خاص طور پر لباس کے ساتھ ساتھ باتوں میں بھی ایک دوسری پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس نے دیکھا اس کے بالکل سامنے فوم کے نرم صوفے پر وہ بھی بیٹھا سوپ پینے میں مصروف تھا۔ پھر وہ چونکی اس کے دائیں قریبی صوفے پر نائلہ اشفاق بیٹھی تھی۔ وہ پھر سے بے چین ہونے لگی۔

نائلہ اشفاق نے کچھ کہا تھا شاید۔ سوپ پیتے پیتے وہ اس کی بات پر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے خالی کپ قریب کی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ اور سیدھا ہوتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ اس نے شاید شانی کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی نائلہ نے توجہ دی تھی۔ وہ تو اس کی قربت میں مست تھی۔

بات کرتے کرتے نائلہ نے اس کے صوفے کے بازو پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اور جھک کر ہنستے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

کامران نے وہیں صوفے کی پشت سے سر ٹیکے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ اور شائی نے دیکھا۔ اس نے اپنا ہاتھ نائیلہ کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ پاگل سی ہو اٹھی۔ اس کے سامنے کتنی قسمیں اٹھاتا تھا۔ ہاتھ جوڑتا تھا۔ معافیاں مانگتا تھا۔ اور یہاں۔ اس وقت پھر؟

بیگم اعظم نے سب کو کھانے کے لئے میز پر آنے کو کہا تو اس نے دیکھا نائیلہ ہی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اس کا ذہن سلگ اٹھا۔ تھکے تھکے سے قدموں کے ساتھ وہ بھی میز تک گئی۔

"ہیلو میری جان"۔ وہ پلیٹ میں چاول نکال ہی رہی تھی۔ کہ اس نے بالکل اس کے کان میں آکر سرگوشی کی۔

چونک کر وہ اس کی طرف مڑی۔ اور پھر کئی شکن اس کے خوبصورت ماتھے پر پڑ گئے۔

"خیریت؟"۔ اس کے قریب کھڑے ہو کر اپنی پلیٹ سے کھاتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔ اس کے تیور دیکھ کر ہی وہ سمجھ گیا تھا۔ ضرور کچھ دیر قبل اس نے اسے نائیلہ اشفاق کے ساتھ دیکھا تھا۔

چنگاریاں اگلتی نظروں سے شائی نے اسے دیکھا اور بس۔

"مجھ سے کوئی قصور ہوا ہے؟"۔ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

نائیلہ خود ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ باتوں پہ باتیں کئے جا رہی تھی۔ پھر اتنے سارے لوگ تھے وہاں۔ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔" ہونہہ

"ہاں" میں جواب دنیا دیا تھا۔

شانی اب بھی خاموش رہی۔

"پلیز بولو نا"۔

"بولنے کو دو ہے نا"۔

"پلیز شانی! سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔"

اور شانی کو آگ ہی تو لگ گئی۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہ تھی۔ بار بار ایسا ہو رہا تھا۔ وہ کوئی جواب دیئے بنا اپنی پلیٹ لیئے وہاں سے دوسرے سرے پر چلی گئی پھر واپسی پر کار میں بیٹھی وہ نکل ہی رہی تھی۔ کہ اُس نے دیکھا۔ نائیلہ کار میں بیٹھے کامران کو اُسے گھر پہنچانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ وہ آگے چلی آئی تھی۔ یقیناً کامران نے اُسے سمجھایا ہوگا۔ اخلاقی فرض جو تھا۔

گھر پہنچی تو اُس کے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ پچھلی ملاقات میں اُس نے اُس پر اپنا پیار بھی ظاہر کر دیا تھا۔ اپنے منگیتر سے بچنے کی التجا بھی کی تھی۔ اُسے شرمندگی کا احساس ہوا۔

پھر اُسے یاد آیا۔ اگلے دن صبح ہی صبح وہ ابھی بستر میں تھی۔ کہ اس نے فون کر کے اُسے اُسکی برتھ ڈے کی مبارکباد دی تھی۔ وہ بھی دیر تک اس کی طلسماتی باتوں میں کھوئی۔ اُس سے بولتی رہی تھی۔ نائیلہ کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اُس نے بلا جھجک اُسے نائیلہ سے ملنے سے روکا تھا۔ عین اپنا حق جان کر جیسے۔ پھر شام ٹھیک چار بجے اُس کا ڈرائیور اس کا دیا ہوا بڑا سا بہت عمدہ کیک اس کے لئے لایا تھا۔ اور پھر پہلی بار خود سے فون کر کے اُس نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ کیوں ہوا تھا یہ سب؟ کیوں وہ

بار بار اُس کے دھوکے میں آجاتی تھی؟ -

وہ بے طرح پشیمان ہوئی جھنجھلائی۔ اور آخر میں حسب عادت۔ دیر ی -
آج اُس نے عرصہ بعد ڈھیر سارے خط لکھے تھے۔ کئی دوستوں کے خطوں کے جواب دینے تھے۔ چار خط کامران کے بھی آئے پڑے تھے۔ "اسے تو آخری فیصلہ لکھدوں"۔ اُس نے جھنجھلا کر پن اُٹھایا۔ اور اُسے بھی جواب لکھدیا۔
"میں اس منگنی پہ پابند نہ رہ سکوں گی۔ مجھے افسوس ہے"۔ اس نے اُسے لکھا۔
خط لفافے میں بند کیا۔ ایڈریس لکھا۔ اور لفافہ الگ رکھدیا۔ باقی کے سارے خط ڈرائیور کو پوسٹ کرنے کو دیدئیے۔

وہ نیچے اُتر کر لان میں نکل آئی۔ کیا پہاڑ۔ کیا زمین۔ سبھی برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ عمارتیں۔ ٹیلے۔ خود رو جھاڑیاں سبھی سفید برف میں ملبوس تھے۔ نیلگوں آسمان صاف شفاف تھا۔ سنہری دھوپ سر سوچیلی برف پر منعکس ہو کر نظروں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ نالے کے رخ پر لان کے اونچے کنارے پر دھیرے دھیرے چلتی وہ کامران کو خط میں لکھے اپنے فیصلے پہ سوچتی رہی۔ "ٹھیک ہی کیا ہے"۔ اس نے سوچا "یہاں کیا کم آزمائشوں میں گھری تھی، کہ وہ بھی وبالِ جان بنا ہوا تھا۔ ایک مصیبت سے تو جان چھوٹے۔ ایک طرف سے تو سکون ملے ۔۔۔"

وہ واپس اپنے کمرے میں آئی۔ کوٹ بدلا۔ لونگ شوز پہنے، ہاتھوں میں گلوز پہنے، گرم ٹوپی اچھی طرح کانوں کے گرد لپیٹ کر لفافہ اُٹھایا۔ اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئی۔

ماما شاید کچن سائیڈ پہ تھیں۔ اس نے مالی سے ماما کو اس کے باہر جانے کا بتانے کا

کہا۔ اور نیچے تلے قدم رکھتی گیٹ سے باہر نکل آئی۔ برف سے اٹی کچی سڑک پر بمشکل قدم رکھتی وہ آگے بڑھنے لگی۔ ڈاکخانہ بالکل قریب ہی تھا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے طبیعت بور ہو رہی تھی۔ سوچا ڈاک بھی ہو جائے گی۔ خط بھی ڈال آئے گی

اب وہ لیٹر بکس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اونچائی پر ایستادہ لیٹر بکس تک پہنچنے کے لئے اس نے خط کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اور دونوں ہاتھ اوپر برف میں بمشکل جماتے ہوئے جسم کو سنبھالا دیکر وہ اوپر چڑھ آئی۔ ہاتھ جھاڑے۔ لفافہ جیب سے نکالا "کوئی خاص خط ہے جس کے لئے اتنی تردد کی ضرورت پڑی" اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

وہ بھی پیچھے پیچھے ہی چلا آرہا تھا۔ اس نے دور سے اُسے سڑک پر چلتے دیکھا تھا پھر اس نے کار کی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ اور جب وہ لیٹر بکس کے قریب پہنچ گئی۔ تو وہ بھی چلا آیا تھا۔ آہستہ سے گاڑی روک کر بالکل دھیمے سے دروازہ بند کیا تھا۔ پھر وہیں کھڑے ہو کر اُسے اوپر چڑھتے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے بھی خط پوسٹ کرنا تھا۔ اس اتفاق پر اُسے ہنسی بھی آئی۔

"آپ ۔۔۔ آپ میرے پیچھے کیوں ۔۔۔" اُسے اگنے ہی تو لگ گئی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اور آگے بڑھ کر نا پیکہ سے بل مل کر وہ اُسکی توہین ہی تو کر رہا تھا

"میں خط پوسٹ کرنے آیا ہوں"

"ڈالیں پھر۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

"تم پہلے ڈالو" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہیں زیادہ جلدی ہو گی خط پہنچ جانے کی"۔

اور ایک خشمگیں نظر اُس پہ ڈال کر شائی نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ T اور S کے مابین سرکا دیا۔
"کامران کو لکھا ہے شاید"۔ پورا پتہ پڑھ لینے کے بعد بھی وہ انجان بن کر پوچھنے لگا۔
"آپ کام سے کام رکھیں"۔ وہ تلخی سے بولی۔
اُس نے دیکھا۔ آج وہ پھر یکسر تبدیل ہوئی۔ تیز تیز اور ناراض ناراض لگ رہی تھی۔
اُس نے کوٹ کی جیب سے لفافہ نکالا۔ دانستہ اُس کی نظروں کے سامنے نچایا۔
"کام سے کام رکھ رہا ہوں"۔ اُس کی طرف دیکھے بغیر وہ دھیرے سے بولا۔
"یہ۔۔۔ یہ تو میرا ایڈریس ہے" وہی مخصوص نیلے رنگ کا لفافہ۔ وہی منیلہ رائٹنگ
اور اپنا ایڈریس دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو جیسے کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ ہاتھ بڑھا کر جھپٹنے کی کوشش
کرتے ہوئے بے اختیار بولی۔
"ہٹو بھی"۔ اُس نے اُس کا وہی ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ میری منگیتر کا ایڈریس ہے"۔
اور خط اُس کی زد سے بچا کر جلدی سے بکس میں ڈال دیا۔
"آداب"۔ حیران و پریشان کھڑی شائی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقعہ دینے سے
قبل ہی وہ اُسے اچانک گود میں اٹھا کر آرام سے نیچے اُتر گیا۔
"آپ لوفر ہیں۔ غنڈے ہیں"۔ وہ پھر سے تمام آداب بھول گئی۔
"مجھے معلوم ہے"۔ اُس نے اُسے سیٹ پہ ڈالا۔ دروازہ بند کیا۔ سامنے سے
گھوم کر اپنی سیٹ پہ آیا۔ اور ایکدم ہی گاڑی چلا دی۔
"میں کہتی ہوں آپ سخت آوارہ ہیں"۔ وہ آپے سے باہر ہو کر چیخی۔
ایسا بہروپیہ انسان اُس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا ایڈریس
حاصل کر کے کامران بن بن کر اُسے خط لکھتا رہا تھا۔ وہ بھی نادانستگی میں جواب پہ جواب

دبے جا رہی تھی۔

اور پھر اُس دن تو اُس نے پریشانیوں سے گھبرا کر اُسے اپنے دل کا حال بھی بتا دیا تھا۔ اُسے زبردست شرمندگی کا احساس ہوا۔ یہاں اگر اُس سے پیار جتاتا تھا۔ اور اُس سے رخصت ہو کر نائلہ اشفاق کی شامیں رنگین بناتا تھا۔ پھر اُس کے سامنے قسمیں اُٹھاتا تھا۔ باقاعدہ جوڑتا تھا۔ کہ پھر اس سے نہیں ملے گا۔ مگر آگے بڑھتے ہی سب بھول بھال پھر اُسی میں مگن ہو جاتا تھا۔ اُس سے فون پر باتیں کرتا تھا۔ ملتا تھا۔ کار میں لفٹ دیتا تھا۔ سب کرتا تھا۔ اور ان سب کے باوجود وہ بار بار دھوکہ کھا جاتی تھی۔ اپنی بیوقوفی اور اُسکی ڈھٹائی پر وہ کھول کھول اُٹھی۔

" اور کیا کیا ہوں ؟"۔ سامنے دیکھتے ہوئے وہ گہرے اطمینان سے بولا۔

" اوہ شٹ اپ "۔

" اور ؟ "۔

" آپ اوّل درجہ بدمعاش ہیں "

اور اُس نے اپنی خوبصورت آنکھیں پوری کھول کر نچائیں۔

" لیکن ان سب کو اگر ملا لو۔ تو بچارا کامران بن جاتا ہے"۔

ایک پل کو اُس نے کامران کی طرف دیکھا۔ یقیناً نیا فراڈ تھا یہ۔ پہلی ملاقات سے لے کر آج تک وہ طرح طرح سے بیوقوف بناتا آیا تھا اُسے۔ پھر آج تو۔ حد ہو گئی تھی۔ کامران بن بن کر اُسے خط لکھتا رہا تھا۔ جواب میں اُس کے خطوط بھی وصول کرتا رہا تھا۔ اور پھر

اس وقت خود کو کامران ہی بتا رہا تھا۔ اُسے لگا۔ آج زندگی کا سب سے بڑا مذاق اُس کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ وہ پھر بے بس ہونے لگی۔ دل بے تابو ہونے لگا۔

"مجھے گھر واپس لے جائیں"۔ وہ بظاہر سپاٹ لہجے میں بولی۔

وہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے گاڑی قصبے سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دی تھی۔

"نہیں لے جاتا"۔

"پھر یہیں اتار دیں"۔

"نہیں"۔

"اوہ۔ آپ کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے"۔ اُس کی آواز میں بے بسی سمٹ آئی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا"۔

"میرا پیچھا چھوڑ دیں ....." وہ بازو میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"نہیں"۔ وہ بے رحمی سے بولا۔

"مجھے اور تنگ نہ کریں"۔ وہ مزید رو دی۔ "ورنہ میں زہر کھا لوں گی"۔

اُسے اِس اِنعان کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ نہ اُسے چھوڑتا تھا۔ نہ اُس کا بنتا تھا۔ اور۔ اور

پھر اُسے خیال آیا۔ کامران۔ اُس کا منگیتر اس پورے معاملے سے الگ تھلگ ایک شخصیت تھا۔ اُسے خبر تک نہ تھی۔ خط و کتابت کا سارا ڈرامہ سی

نے کھیلا تھا۔

کہیں اُس سے پیار کا دعویٰ بھی ایک مذاق تو نہیں تھا؟۔ اُس سے مل کر اچھی طرح دل بہلا کر وہ چل دیا تھا۔ یقیناً ایسا تھا۔

"اوہ پروردگار"۔ وہ جیسے تھک سی گئی۔ اُس سے یہ گتھی نہ سلجھائی گئی۔ وہ مزید رونے لگی۔ قسمت اُس کے ساتھ ایک عرصہ سے عجیب و غریب کھیل کھیل رہی تھی۔

"میں کامران ہوں شائی"۔ کار ایک طرف روک کر اُس کا سر اپنے پہلو سے لگاتے ہوئے وہ اپنائیت سے کہنے لگا۔

"مجھے اور دھوکا مت دیں پلیز"۔ وہ تو سرے سے یقین ہی نہیں کر رہی تھی۔ اور پھر اُس کے اَن گنت چرکے سہہ کر تو وہ اس قابل ہی نہ رہی تھی، کہ اُس کا یقین کرے۔

"سچ کہہ رہا ہوں شائی۔ میری پوسٹنگ یہاں ہوئی۔ تو مجھے شبہ تھا۔ کہ تم مجھے الگ اور اپنے منگیتر کو الگ شخصیت سمجھ رہی ہوگی۔ کیونکہ وہاں بھی ہم ٹھیک سے ملے نہیں تھے۔ پھر تمہارے یہاں آتے ہی ہماری منگنی ہوگئی۔ میں نے امّی سے کہا تھا۔ کہ ڈیڈ سے کہہ دیں۔ وہ رشتہ مانگتے وقت ایسا کوئی ذکر نہ کریں۔ کہ میں تم سے پہلے سے واقف ہوں۔ یہ بھی نہیں کہ چند ماہ میں وہاں ڈی سی رہا تھا۔ کیونکہ۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ تمہارے بابا جان یا کوئی اور اس سے پہلے کی واقفیت کو غلط انداز میں سوچیں پھر درمیان میں وقفہ بھی بہت کم تھا۔ میں یہاں آیا۔ تو مبہم سی امید تھی۔ کہ شاید تمہیں معلوم ہو چکا ہو۔ مگر پورا یقین نہیں تھا۔ تم سے ملا۔ تو تم نے میرے شبے کی تصدیق

کردی۔ تم واقعی لاعلم تھیں۔ پھر . . .

پھر مجھے مزہ آنے لگا۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اُس کے بالوں پر پیار کیا اور کہنے لگا "تم نے محسوس بھی نہیں کیا۔" وہ پھر ہنس دیا۔ "میں تمہیں اتنا فرینکلی سینے سے لگا لیتا تھا۔ بے تحاشہ پیار کرلیتا تھا۔ کسی غیر لڑکی سے اچانک اتنا فری ہوجانا ممکن ہے کیا؟ . . ."۔

مگر وہ گھر جانے پر بضد رہی۔ اُس کے تو محسوسات گڈمڈ سے ہورہے تھے۔ اوّل تو اُسے اس کے کامران ہونے پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ اگر یہ ہی کامران تھا۔ تو اُس کے منگیتر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس دنیا میں؟ اور یہ کیونکر ممکن تھا۔ وہ ایک عرصے سے اپنے منگیتر کا وجود مسلم سمجھتی آئی تھی۔ اور اس کو۔ اس کو تو جھوٹا۔ فریبی۔ دھوکا باز مگر ساتھ ہی بہت انوکھا۔ بہت دلچسپ اور بہت پیارا سمجھ رہی تھی۔

کیسے وہ ان دو شخصیتوں کو ایک سمجھ لیتی؟ ۔اتنی جلدی اور اتنا اچانک ۔ اُس کے ذہن و دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کس کا اعتبار کرے اور کس کو جھٹلا دے؟ ۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"میں گھر جاؤں گی"۔ اُسے فرار کا یہی راستہ نظر آیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں نہیں لے جاؤں گا۔" اُسے پہلو میں لیے لیے وہ خوشدلی سے بولا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" اس کی گرفت سے اپنے کو چھڑاتے ہوئے وہ جذبات سے عاری آواز میں بولی۔

"اوہ"۔ وہ اچانک اُداس ہو گیا۔

اُسے اپنا تعارف کرا دینے کے بعد شاید اس کے محسوسات بھی بہت نازک ہو گئے تھے۔ یا

پھر۔ شاید منگیتر ہونے کے ناطے وہ کچھ زیادہ ہی توقع کرنے لگا تھا۔

"نہیں۔ میں چھوڑ آتا ہوں"۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا۔

اور گاڑی واپس موڑ لی۔

دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے گیٹ پر اُتر گئی۔

"خدا حافظ"۔ کامران نے ہولے سے کہا۔

"خدا حافظ"۔ اُس نے سُرخ سرخ آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھا۔

اُس کی نظروں میں شکوے تھے شکائتیں تھیں۔ بے یقینی تھی۔ اداسی تھی۔ مگر۔

یقین کا بھروسے کا۔ اعتبار کا اعتماد کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

☆ ۴۳ ☆

کبھی اُسے لگتا .وہ واقعی کامران ہے۔ اس کا منگیتر۔

اس کے لہجے کا ٹھہراؤ اس کی بات کی صداقت کا ثبوت مہیا کرتا۔

پھر کبھی اُسے لگتا۔ یہ ناممکن تھا۔ یہ بھی ایک نیا فراڈ تھا۔ سارا وقت سوچ

سوچ سوچ کر وہ نڈھال سی ہو گئی۔

کبھی اُسے خیال آتا۔ واقعی وہ کتنی بے تکلفی سے اسے سینے سے لگا لیتا تھا۔

کبھی کبھی تو خود اُسے بھی اُس کے بے تحاشہ پیار کرنے پر۔ اُس کی دلیری پر حیرت ہونے لگتی۔ یہ سوچتے ہی وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ اور

پھر اُسے ضرورت بھی کیا تھی، اُس کا منگیتر بننے کی؟

اتنا بڑا جھوٹ۔ اتنا زبردست مذاق!

اور پھر وہ خود ہی ہنس پڑی

یہ جھوٹ اُس کے نزدیک بالکل بڑا نہیں تھا۔ نا ہی یہ مذاق اُس کے سامنے اتنا زبردست تھا۔ وہ تو۔ وہ تو بہت کچھ کہتا تھا۔ بہت کچھ کرتا تھا۔ اُسے اُس کی پچھلی حرکتیں یاد آئیں۔ جب اُس کے امتحان نزدیک تھے۔ اور وہ روز روز انوکھی باتیں اور انہونی حرکتیں کرتا تھا۔ لیکن

پھر اچانک اُسے یاد آیا۔ ایک خط میں اُس نے اپنی آمد کا لکھا تھا۔ اُس تاریخ کو اُس دن کو

وہ اُس کی آمد کی متوقع تھی۔ دن سارا گزر گیا تھا۔ مگر وہ نہیں آیا تھا۔ پھر شام کو یہ ہی ملنے آ گیا تھا۔ تبھی چونک کر اُس کا دل دھڑک اٹھا۔ خط میں لکھے ہوئے دن اور تاریخ کے مطابق تو کیا کامران۔ تو آیا ہی نہیں تھا پھر۔

اُسے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا۔ پھر کئی ملاقاتیں یاد آئیں۔ کئی ذومعنی باتیں۔ پہلی ملاقات میں جس بیقراری سے وہ اُسے ملا تھا۔ اور پھر ہر بار ہی ملنے پر اُس کا اُسے بے تحاشہ پیار کرنا۔ سب یکے بعد دیگرے اُسکی نظروں کے آگے گزرنے لگے۔

اور

اُس کے شبے کو تقویت ملتی رہی۔ اور پھر کوئی مکمل ثبوت مہیا نہ ہونے کے

باد جود اُسے پھر سے غصہ آ گیا۔ بلکہ اُس نے محسوس کیا۔ اب کے جلیبی اپنے عروج پر تھی۔ دل اُسے آہستہ آہستہ کامران مان رہا تھا۔ ذہن ابھی مزید دلائل سوچ رہا تھا۔ کہ جلیبی منیر سے گئی۔

اگر وہ کامران تھا۔ تو اس کی منگیتر ہونے کے ناطے وہ اس پر پورا پورا حق رکھتی تھی۔ وہ صرف اور صرف اُس کا حق بنتا تھا۔ کل تک تو وہ اسے صرف اپنا پیار۔ وہ بھی مجبور پیار سمجھ کر اُسکی نائلہ سے ملاقاتوں پر خاموش تھی۔ خاموش تو کیا بلکہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ اُس کی دانست میں وہ کسی اور کی امانت تھی۔ اس لئے وہ اس پر زبردستی نہیں کر سکتی تھی۔

مگر اُسے تو علم تھا ناکہ وہ ہی اس کا منگیتر ہے۔ پھر وہ نائلہ سے کیوں ملتا پھرتا تھا؟ کیوں اس کے فون ریسیو کرتا تھا؟ اور کیوں اُسے کار میں لفٹ دیئے پھرتا تھا؟؟۔

اتنے عرصے کا برداشت کیا ہوا اشتعال اس وقت طوفان بن کر امڈ پڑا۔

وہ تو اُسے صرف اپنا پیار سمجھتے ہوئے ہی نائلہ سے اس کا میل جول برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چہ جائیکہ اس کا منگیتر ہو کر وہ اس کے ساتھ گلچھرے اڑاتا پھرے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ اُس کا اشتعال بڑھتا ہی رہا۔ اب تو ہر وقت اُس کی آنکھوں میں اُس کا نائلہ کے ساتھ باتیں کرنا۔ رائیڈنگ کرنا۔ فون اور کئی واقعے گھومتے رہتے۔ اب تو وہ اُس کے سارے مذاق یا دوسرے لفظوں میں بقول اُس کے سارے فریب بھول بھال گئی تھی۔

بس ایک ہی بات یاد رہ گئی تھی۔ اور وہ تھی نائلہ اشفاق سے اُسکی ملاقاتیں۔

"نائیلہ اشفاق کے یہاں۔ اُس نے مجھے بلایا تھا۔" ایک دن کس اطمینان سے
وہ بولا تھا۔
اُس کی بر تھ ڈے کا بھی نائیکہ نے اُسے بتایا تھا۔
جانے کیوں؟ وہ کسی طرح بھی برداشت نہیں کر پارہی تھی۔ اُس سے بے تحاشہ
پیار تھا شاید۔ اور
یا پھر۔ اب اسے یہ معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہی اُس کا منگیتر بھی ہے۔ جبھی
شاید جیلیسی لاوا بن کر پھوٹ نکلی تھی۔ وہ اُس کا منگیتر کامران ہی تھا۔ کل ہی وہ اپنی
امی کو لے کر آیا تھا۔ اب کے گاڑی سیدھی گیٹ سے لاکر پورٹیکو میں لا کھڑی
کر دی تھی۔
تمام نوکروں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور بقول ماما ان کی تو دلی مراد بر آئی
تھی۔ وہ تو اُسے دیں اُس کے لئے دل ہی دل میں پسند کر آئی تھیں۔ کیا عجیب اتفاق تھا؟
امی اوپر اُس کے گرم گرم بیڈ روم میں بیٹھی تھیں۔ اور وہ نیچے ڈرائنگ روم میں
بڑی بڑی لکڑیوں کی جلتی آگ تاپ رہا تھا۔ "امی پلیز! مجھے اوپر بلائیں۔" وہ گھڑی
گھڑی سیڑھیوں تک آکر ہانک لگاتا۔
"بیٹے بس بھی کرو اُسے شرم آرہی ہے۔" امی نے اُس کے سرخ چہرے سے
یہی اندازہ لگایا تھا۔
امی کی موجودگی میں ایسی ہانک پر وہ واقعی سرخ ہو گئی تھی۔
پُر تکلف چائے پی کر وہ لوگ شام کے وقت رخصت ہونے لگے۔ تو امی کے
ساتھ وہ بھی پورٹیکو میں کھڑی کار تک آگئی۔

"کل میری برتھ ڈے ہے آؤ گی نا؟" امی کو بٹھا کر دروازہ بند کرتے ہوئے اُس نے سب کی نظریں بچا کر دھیرے سے کہا۔

اور وہ اُسے کوئی جواب دیئے بنا امی کو "خدا حافظ" کہہ کر پیچھے ہٹ آئی۔

وہ بجھ سا گیا۔ اور پھر کھوکھلا پھولا منہ لئے کار میں بیٹھ کر چل دیا۔

"خود تو اتنا حساس بنتا ہے۔ دوسروں کے جیسے دل ہی نہیں"۔ اُس نے سوچا اور اوپر چلی آئی۔ اُس نے نائیلا اشفاق کو بھی بلایا ہوگا۔ یقیناً۔ وہ کبھی بھی اُس کی برتھ ڈے پر نہیں جائے گی۔ اُس نے عزم کر لیا۔

پھر رات کو اُسے اس کا برتھ ڈے کارڈ بھی ملا۔ اُس نے کتنا خوبصورت تحفہ اُسے اُس کی برتھ ڈے پر دیا تھا۔ ایک پل کو اُسے خیال آیا۔ مگر پھر اُس نے یہ خیال جھٹک دیا۔

کیوں وہ ہر بار ہی اُس کی ناراضگی کے باوجود نائیلہ سے ملنے چلا جاتا تھا۔؟

رات اُس نے فون بھی کیا۔ اُس کے آنے پر اصرار بھی کیا۔ مگر اُس نے فون ہی بند کر دیا۔ وہ تو اُس سے ناراض تھی۔

شدت سے۔ وہ تو پہلے بھی اُس کے نائیلہ سے میل جول پر اداس رہتی تھی۔ مگر جب اُسے علم ہوا کہ وہی اس کا منگیتر ہے۔ اور اچھی طرح سمجھ بوجھ کر نائیلہ سے ملنے جاتا ہے۔ تو اس کی ناراضگی مزید گہری ہو گئی۔ بلکہ وہ تو کامران کی نائیلہ کے متعلق باتیں یاد کر کر کے کھولتی رہی۔ کیا وہ منگیتر ہونے کے ناطے ذرا بھی اس کا پابند نہیں تھا؟

امی نے اس کا نہ آنا شرم سے تعبیر کیا۔ مگر کامران نے دل ہی دل میں اس کی پہلی بار آمد کا جو حسین تصوراتی محل تعمیر کیا تھا۔ وہ چکنا چور ہو گیا۔

اُس نے طبیعت کی اچانک خرابی کا کہہ کر سب سے معذرت کرلی۔ اور یوں وہ زندگی میں پہلی بار اپنی سالگرہ نہ منا سکا۔ گو کہ امی نے شام چلتے پر اس سے کیک کٹوایا۔ غریبوں میں حسبِ معمول خیرات بھی تقسیم کی، مگر اُس کے دوست احباب اکٹھے نہ ہو سکے تھے۔ بلکہ سب کو جا کر پیغام کر بھی دوبارہ سب سے معذرت کرلی تھی۔ شانی کے انکار پر تو اُس کا دل ہی بجھ گیا تھا۔ فنکشن کیا خاک منانا، بجھی بجھی صورت لیے وہ دوستوں کو خوش آمدید کہہ سکتا تھا۔

امی نے بہتیرا سمجھایا، مگر اُس نے پروگرام کینسل ہی کر دیا۔ امی کو یقین تھا شانی آتے ہوئے شرما رہی تھی۔ اور

پھر اُس نے بھی دل کا غبار اُس نکالنے کی ٹھان لی۔

"تمہاری وجہ سے میں نے اپنی سالگرہ نہیں منائی"۔ رات وہ فون پر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"میری وجہ سے؟" اُس کے لہجے سے طنز عیاں تھا۔

"ہاں تمہاری وجہ سے"۔ اُس کے لہجے میں تیزی آگئی۔

"نائیلہ اشفاق تو آرہی تھی نا"۔

"میں نے اُسے نہیں بلایا تھا"۔ وہ مزید تیزی سے بولا۔

"بلا لینا تھا نا"۔ وہ طنز سے بولی۔

"بیکار طنز کیوں کرتی ہو؟"

"آج وہ بیکار کیسے ہوگئی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن تم یقیناً میری خوشیوں سے جلتی ہو"۔ اُس کی آواز میں کڑک تھی۔

ایک پل کو تو وہ سہم سی گئی۔

"مناسب نا خوشی منع کس نے کیا تھا؟" ایک تو نائلہ سے برابر جلتا رہتا تھا۔ اُوپر سے رعب بھی ڈالتا تھا۔ سنبھلتے ہوئے اُس نے بھی کہہ دیا۔

"اوہ ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ۔۔۔" وہ اُس سے اتنی تلخ باتوں کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مارے غصّے کے کچھ بول ہی نہ سکا۔

اور شائی نے ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔ سلسلہ منقطع پاکر تو کامران مزید مشتعل ہو گیا۔ اور پھر رات بھر اُسے نیند ہی نہ آئی۔

وہ کتنا بے تحاشہ چاہتا تھا اُسے۔ کیا وہ اندازہ نہیں کر سکتی تھی؟ اگر اب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کامران وہ ہی ہے تو اس میں اس کا اتنا بھی قصور نہیں تھا۔ حالات اور واقعات ہی کچھ ایسے پیش آ گئے تھے۔ پھر اگر اُس نے مذاق کو تھوڑا طول دے ہی دیا۔ تو اُس میں ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی تھی جس کی تلافی ناممکن ہو کر رہ گئی تھی۔

رہی نائلہ اشفاق کی بات۔ تو وہ بھی صرف اتفاقات اور حالات پہ منحصر تھی۔ شروع میں تو وہ اُسے سمجھ ہی نہ سکا تھا۔ پھر جان گیا کہ وہ اُس میں دلچسپی لیتی ہے۔ تو اُس نے اُسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔

شائی نے اگر دونوں کو اکٹھے ریڈنگ کرتے دیکھا بھی تھا۔ تو اس میں اُسکی مرضی کو تو دخل نہیں تھا نا۔ نائلہ ہی نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

پھر فون پر اُسے شائی کی برتھ ڈے کا پتا کروا تھی اُسے اپنے یہاں بلایا تھا۔ مگر اُس نے دل میں معذرت کرلی تھی۔ شائی کو تو از راہِ مذاق اور پھر صرف اس خیال سے کہ اُسے جلا کر اُس سے اپنے پیار کا اقرار اگلوائے گا۔ اُس نے دہاں جانے دکھا تھا

اگر مسجدِ اعظم کے یہاں ڈیزی بن وہ پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ تو اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں اُٹھ کر دوسری طرف جانا اُسے عجیب سا لگا تھا۔ پھر اُسے یاد آیا نائلہ نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اُس نے فوراً ہی ہاتھ نکالنا چاہا تھا۔ مگر اُسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ نائلہ نے اپنی گرفت اُس کے ہاتھ پر سخت کر لی تھی۔ پھر جیسے موقعہ پا کر لوگوں کی نظریں بچاتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال ہی لیا تھا۔ شانی نے شاید وہ بھی دیکھا تھا۔ مگر اس پورے معاملے میں اس کا قصور بھی کتنا تھا؟ ۔ وہ تو اُسے زندگی کی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ چاہتا تھا۔ کیا وہ اس پر اتنا اعتماد بھی نہیں کر سکتی تھی؟ ۔

۳۴

میس کی لائبریری میں بیٹھی وہ باربرا کارٹ لینڈ کا A VIRGIN IN PARIS بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھی، اُس کے سامنے میز پر چند رنگین چوکلیٹ سے اتارے گئے کاغذ رکھے تھے۔ جو ناول پڑھنے کے ساتھ وہ گاہے گاہے کھاتی گئی تھی۔

اچانک ہی اُس کی نظریں اُٹھیں۔ کھڑکی کے چوڑے شیشوں کے اُس پار اُس نے دیکھا۔ سنہری دھوپ میں کامران کار سے اُتر رہا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ تبھی شاید وہ بھی لائبریری چلا آیا تھا۔ میس حوالدار نے اُسے اپنے فوجی انداز میں سیلیوٹ کیا تھا۔ پھر لپک کر اُس کے لئے لائبریری کا دروازہ کھولا تھا ادھر شانی کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑک اُٹھا تھا۔ اُس رات اس کے ساتھ فون پر باتیں کرنے کے بعد وہ اُس سے پھر نہیں ملی تھی۔ نا ہی کامران نے ملنے کی

کوشش کی تھی۔ یوں ایک جھجک سی مانع ہوگئی تھی کہ اس کے آگے۔ اُس کا سامنا کرنے کی اس وقت اس میں ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

کامران اندر چلا آیا۔ سامنے ہی اُس پہ نظر پڑی۔ ایک پل کو تو آنکھیں شوق سے چمک اٹھیں۔ مگر پھر اُس کی جگہ گہری اداسی نے لے لی۔

شائی ناول سامنے کرا ٹھ کھڑی ہوئی تبھی وہ قریب آپہنچ گیا۔

"کہاں جارہی ہو؟"۔ گہری اداسی کے ساتھ ساتھ اُس کے لہجے میں تحکم نمایاں تھا۔

"گھر"۔ اس وقت پھر سہم جانے کے باوجود وہ اپنی ضد پہ قائم تھی۔

اور ــ اُس کا چہرہ مزید اُداس ہوگیا۔ آنکھوں میں چھایا کرب اور بھی گہرا ہوگیا۔

شائی کانپ کر رہ گئی۔ مگر اُس کا سامنا نہ کرسکی کترا کر باہر نکل آئی۔ کامران کی ناراضگی کئی گنا بڑھ گئی اور

شائی اُس کی آنکھوں میں چھایا کرب اور چہرے پہ پھیلی اداسی دیکھ کر اپنا رہا سہا چین بھی گنوا بیٹھی۔ وہ تو فون پہ ہی چند جملے کہہ کر اور اُس کا اضطراب بھانپ کر پچھتا رہی تھی۔ چہ جائیکہ اُس کے سامنے ہی اُسے یوں روکھا سا جواب دیکر چلی آئی۔

کل بابا جان پہنچ رہے تھے، اور کل ہی اُسے قریبی ایک سٹال والوں نے مطلع کیا تھا۔ نیا مال آیا تھا جس میں شکار سے متعلق کتابیں بھی تھیں۔ وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ بابا جان کی آمد پہ انہیں شکار سے متعلق خوبصورت کتاب پیش کی جائے۔ اُس کے خیال میں بہترین تحفہ تھا۔

اِدھر اُدھر کی چند چیزیں خریدنے کے بعد اُس نے ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی بک سٹال

کے سامنے رکوائی۔ اور خود اُتر کر نپے تلے قدم اُٹھاتی اندر داخل ہو گئی۔
وہیں اُسے امّی نظر آئیں۔
"آداب امّی"۔ اُس نے پاس جاتے ہوئے عقیدت سے کہا۔
ساتھ ہی قریبی شیلف کے پاس کھڑے کامران نے گھوم کر دیکھا۔
امّی تو شائی کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھیں۔ مگر شائی نے دیکھا۔ کامران پہلے سے کہیں زیادہ اداس تھا۔ نظریں ہزاروں شکوے لیے تھیں۔
"کامران! کل بھائی فصیح احمد پہنچ رہے ہیں"۔ امّی نے اُسے متوجہ دیکھ کر کہا
"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اب یہ اکیلی نہیں رہیں گی"۔ وہ ایک قدم چل کر ان سے آ ملا۔ مگر لہجہ اب بھی گہری سنجیدگی لیے تھا۔
"کتنے بجے پہنچ رہے ہیں، ہم بھی لینے ایئرپورٹ جائیں گے"۔ امی نے مزید پوچھا۔ "کیوں بیٹے؟"۔ وہ کامران سے مخاطب ہوئیں۔
"ضرور امّی"۔ وہ اب بھی اداس تھا۔
شائی پھر بے چین ہو گئی۔
تھوڑی دیر وہ مختلف شیلفوں پر نظریں دوڑاتا رہا۔ شاید امّی کا منتظر تھا۔ مگر اُنھیں مصروف دیکھ کر وہ باہر کی طرف چل پڑا۔
شائی نے دیکھا اُداسی کے ساتھ ساتھ وہ جھنجھلایا جھنجھلایا سا بھی تھا۔
پھر کل چار بجے وہ ساٹھ میل طے کر کے ایئرپورٹ پہنچی۔ تو امی اور کامران پہلے سے وہاں موجود تھے۔
کامران نے باباجان کو خوش آمدید کہا۔ باباجان نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ باباجان کامران کی کار میں اُس کے ساتھ آگے بیٹھ گئے، اور اپنے ڈرائیور

کو گھر روانہ کرتے ہوئے ثنائی کو امی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ کامران نے خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مگر نظریں اب بھی اُداس اور شکایتیں لیئے تھیں۔

وہ گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کامران نے پہلی بار بابا جان کے اعزاز میں شاندار دعوت دی تھی۔ ثنائی کو بابا جان کے سامنے مجبور ہونا پڑا تھا۔ یہ نہیں تھا۔ کہ وہ اب تک کامران سے ناراض تھی۔ چند دِنوں کے سوچ بچار۔ ذہن ودِل کے دلائل سے وہ اُس کی بے گناہی کی قائل ہوگئی تھی۔ بلکہ یہ بھی نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ بے تحاشہ پیار نے اُسے معاف کروا دیا تھا۔

اب تو ایک جھجک سی۔ ایک سہم سی۔ مانع تھی اُس کے اور کامران کے درمیان۔

وہ چاہتی تھی۔ کہ اُس سے پھر ملے۔ ڈھیر ڈھیر ساری باتیں کرے۔ DASHING PERSONALITY- اور مسحور کُن باتوں والا شخص اب اُس کا اپنا تو تھا۔ مگر۔ وہ تو ناراض تھا۔ بُری طرح۔

پھر اُس کی بھی FEELINGS اچانک کچھ اور سی ہوگئی تھیں۔ وہ اُس کا منگیتر تھا۔ اُس سے عمر میں بڑا تھا۔ اُس کے لہجے میں منگنی کے انکشاف کے بعد اچانک تحکم سا اُبھر آیا تھا۔ وہ پہلے سے اُسے یکدم ہی کچھ اور لگنے لگا تھا۔

بڑا۔ باس قسم کا۔ مدبّر۔ رعب داب والا۔

مگر پھر بھی اُسے پیارا تھا بہت زیادہ۔ بلکہ اب تو وہ اُسے اس انکشاف کے بعد اور بھی زیادہ پیار کرنے لگی تھی۔

پیار جس میں بہت کچھ شامل ہو گیا تھا۔ عزت بھی۔ کچھ ادب بھی۔ شوخی بھی۔ کچھ سہم بھی۔

اور اب بھی سہم تھی شاید۔ کہ وہ اُس کا سامنا کرنے سے خائف تھی۔ اُس کے ساتھ تلخی سے جو پیش آئی تھی۔

مگر بابا جان کے آگے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ بابا جان یہاں خصوصی تھے۔ کامران نے جہاں گرمجوشی سے بابا جان کا خیر مقدم کیا۔ وہاں اُس کی آنکھوں میں بھی بغور دیکھا۔ مکمل ناراض نظروں سے

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

اِتنا لمبا چوڑا میچور پرسنیلٹی رکھنے کے باوجود وہ اس وقت بہت معصوم لگا تھا اُسے

بیرے نوکر چاکر موجود ہونے کے باوجود وہ مختلف ڈشیں خود ہی بابا جان کو پیش کرتا رہا۔ ہر بار اُس کے پاس بھی آیا۔ چپ چاپ خاموشی سے ہر بار۔ ہر چیز اُس کی پلیٹ میں خود ہی ڈالتا رہا۔ مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ شائی کی پوزیشن عجیب سی ہو گئی تھی۔ کبھی اُسے ہنسی بھی آ جاتی۔ اچھی ناراضگی تھی یہ بھی۔

وہ بھی بات نہ کر سکی۔ کہ وہ تو ناراض تھا۔ اُسے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا تھا۔

اور پھر یوں ہی ہوتا رہا۔ وہ جگہ جگہ اُسے ملا۔ مگر شائی سے بات نہیں کی۔ اداس اُداس اور ناراض ناراض رہتا۔ شائی کے بھی خودداری آڑے آ رہی تھی۔ وہ پہل کرتا تو وہ بولتی نا۔

۴۵

پھر اچانک ہی ایک دن اُنہیں اطلاع ملی ۔ کہ وہ رائیڈنگ کرتے ہوئے گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا ہے اور ہوسپٹل میں ہے ۔ بابا جان جلدی میں تھے ۔ اکیلے ہی چل دیئے ۔

اور کامران کی ناراضگی مزید بڑھ گئی ۔ کیا ایسی حالت میں بھی وہ اُسے دیکھنے نہ آ سکی ! کیا ایسی ہی اُنکی ذہنی ہم آہنگی تھی آپس میں ؟؟ ۔ ناراضگی اور ضد کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔ اُس نے جھنجھلا کر سوچا ۔ اور پھر اس کی ناراضگی غصے میں بدل گئی ۔

شانی بے چینی سے وقت گزار رہی تھی ۔ بابا جان نے اُسے ساتھ جانے کو نہیں کہا ۔ اور خود سے کچھ کہنے کی اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی ۔

اس نے ماما سے سُنا تھا ۔ اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ۔ پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا ۔ اور اب اُسے آرام تھا ۔ مگر

اُسے کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا ۔ اور آج اُسے احساس ہوا وہ اُسے پیار کے تمام تر جذبوں کے ساتھ چاہتی تھی ۔ خودداری اور ضد کو ایک طرف ڈال کر چاہتی تھی ، بھاگ کر اُس کے پاس پہنچے ۔ اُس سے لپٹ کر اُس سے اپنی زیادتی کی معافی مانگ لے ۔

شام کو وہ بے حد بے چین ہو رہی تھی ۔ کھڑکی میں کھڑی ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی ۔ فضا میں خنکی تھی ۔ پتھریلی زمین ۔ خودرو جھاڑیوں ۔ درختوں اور عمارتوں کی چھتوں پر کی برف پگھل کر بہہ چکی تھی ۔ دور اونچے سرمئی پہاڑوں کی چوٹیاں البتہ اب بھی برف سے ڈھکی ڈھلتے سورج کی روشنی منعکس کر رہی تھیں ۔

تبھی وہ ماما کی آمد پر چونکی -

"بیٹی! صاحب کہہ رہے ہیں آپ بھی جاکر کامران صاحب کو دیکھ آئیں۔"

وہ جھٹ سے تیار ہوگئی - تمام خودداری اور سر ضد پس پشت ڈال کر ہوسپٹل پہنچ کر وہ موٹر سے اتری - اندر داخل ہوئی - لاؤنج میں لگے وی آئی پی رومز کے لوکیشن بورڈ پر نظریں دوڑائیں -

"کامران روم نمبر ۲" اور پھر وہ پل میں ہی اس کے دروازے پر تھی -

" COME IN " - اس کی ہلکی سی دستک پر اس کی بھاری سی آواز سنائی دی - اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوگئی -

سامنے ہی وہ چوڑی کھڑکی کے آگے لگے صاف و شفاف بستر پر دراز تھا - کمبل کندھوں تک لیے اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے - اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں نقاہت سے بند تھیں - ایک طرف ماتھے پر بھی ڈریسنگ ہوئی ہوئی تھی - دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں - ایسی حالت میں وہ پہلی بار اسے دیکھ رہی تھی -

آہٹ پر کامران نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں - اس کی آنکھوں میں ایک پل کو قندیلیں سی جل اٹھیں -

مگر پھر - قندیلیں بجھ گئیں - تاریک سے سائے لہرانے لگے - ایک لمحہ کو وہ ٹھٹک کر رک گئی - نظریں جھکاتے ہوئے چور سی کھڑی ہوگئی - آگے جانے کی ہمت ہی نہ رہی -

تبھی کامران نے آنکھیں بازو سے ڈھک لیں - اس سے ناراض جو تھا - اور شانی دھیرے سے چلتی اس کے بستر تک آگئی - یہاں پھر وہ رک گئی - پھر جھجکتے،

جھکتے آہستہ سے اُس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

دِل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ ہاتھوں تک میں لرزش تھی۔

اور۔ اس وقت اُسے احساس ہُوا۔ ایک عام آدمی سے ملنا الگ بات تھی۔ اور منگیتر کا سامنا کرنا مختلف بات تھی۔ بڑی مشکل۔ بہت بڑی۔

وہ چُپ چاپ بیٹھی اپنی لرزتی انگلیوں کے ناخنوں کو بے مقصد تکتی رہی۔ کئی لمحے بیت گئے۔ وہ تو جیسے بولنا ہی بھول گئی تھی۔ اور اُس کا تذبذب۔ گھبراہٹ۔ اور سٹ پٹاہٹ بھانپ کر کامران کو اُس پر ترس آ گیا۔ ناراضگی تو خود بخود جاتی رہی۔ وہ اُس کے پاس بالآخر آ ہی گئی تھی خود سے بن بُلائے یہ کیا کم تھا؟

"کیسے آنا ہُوا؟" آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہُوئے پھر بھی وہ پھولے پھولے منہ کے ساتھ بولا۔

"میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔" اور ساتھ ہی اُس کی طرف دیکھتے دیکھتے آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔ "روتی کیوں ہو؟" اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اُس نے اُسی لہجے میں پوچھا۔

"آپ۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔" وہ اور بھی رو دی۔

"مجھے کیا ہُوا ہے؟" وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

اُس کا دل اُس کے جسم سے بھی زیادہ نازک تھا۔ فوراً ہی رو پڑتی تھی۔

"آپ۔۔۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟" دوسرے بازو میں مُنہ چھپاتے ہُوئے وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر بولی۔

"اوہ"۔ اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

تو ناز کے سی جان واقعی اُس کی عیادت کو آئی تھی - بالکل یوں پوچھا تھا۔ جیسے اپنی الفاظ میں نہ پوچھا تو وہ پھر ناراض ہو جائے گا -

"کس نے سکھایا تھا ایسا کہنا؟" اتنی معصوم سی جان سے جانے کیوں ؟ اُسے اتنی بڑی بات کی توقع نہ تھی - اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اس نے حیرت سے پوچھا -

"ماما نے کہا تھا - میں خود بھی اسی لئے آئی ہوں" اُس نے جلدی سے کہا - مبادا صرف ماما والی بات پر بُرا مان جائے -

"بیٹی! اُسے پوچھنا ضرور - یہ نہ ہو بیٹھ کر اسی طرح واپس اُٹھ آؤ" انہوں نے اُسے سمجھایا اپنا فرض سمجھا تھا - اپنے منگیتر کو پوچھنے جا رہی تھی نا - وہ نہ سمجھاتیں تو کون تھا اور اُسے سمجھانے والا ؟

اور کامران کو اُس کی معصوم ادا بے خود کر گئی - ہاتھ بڑھا کر اُسے دھیرے سے اپنے سینے پر گرا لیا -

"کبھی کبھی بالکل چھوٹی لگتی ہو - دو تین سال کی - اور کبھی - بہت بڑی - رعب ڈالنے والی - میں تو سمجھا تھا مر بھی گیا تو بھی نہیں آؤ گی - ضدی ہو نا بہت -" اُسے سینے سے لگائے ہاتھ سے اُس کے بال سہلاتے ہوئے وہ اپنائیت سے کہتا گیا - اور وہ مزید رونے لگی کیسی بات کر رہا تھا - وہ مر جاتا تو وہ زندہ رہتی بھلا -

"تم کیوں نہیں بولتی تھیں مجھ سے ؟ کیوں نہیں میری بر تھ ڈے پر آئیں ؟" اُس کا چہرہ اُٹھا کر اُس کی روتی آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے اُس نے شاکی لہجے میں کہا -

"آپ کیوں اُس نائیلہ کی بچی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے؟"۔ وہ معصومیت سے بولی

" اوہ"۔ اُس نے اُس کے چہرے پر اَن گنت پیار کر ڈالے"۔ تم کتنی سویٹ ہو"۔ وہ مسحور سا بولا۔

" آپ کہتے تھے نہیں ملوں گا۔ اور پھر۔ پھر بھی وہاں جاتے تھے"۔ وہ انگلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

" میں صرف ایک بار اُن کے یہاں چائے پر گیا ہوں۔ وہ بھی جب مجھے معلوم نہیں تھا"

"کیا معلوم نہیں تھا؟"

" یہی کہ ۔ ۔" وہ ہنس دیا"۔ جو تم سمجھتی ہو۔"

" رائیڈنگ کرتے ہوئے میں نے خود آپ کو اُس کے ساتھ دیکھا تھا"۔

" اوہ بلیز شانی! میں تمہاری طرف آ رہا تھا۔ تو پیچھے پیچھے وہ چلی آئی تھی"۔

"آپ اُسے اپنے گھر لے کر جا رہے تھے"۔

"اوہ گاڈ۔ کیا کیا سوچتی رہتی ہو"۔ اُس نے پھر اُسے پیار کر لیا" میں سیدھا اپنے گھر اور وہ سیدھی اپنے گھر گئی تھی"۔

میجر اعظم کے یہاں ڈنر میں اُس نے آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا"۔
اُسے ایک ایک کر کے ہر بات یاد آ رہی تھی۔

" اُس نے رکھا تھا نا۔ تم خود کہہ رہی ہو۔ میں نے تو نہیں رکھا تھا نا"۔ وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولا۔

ادرشائی کا پارہ پھر چڑھنے لگا۔

"کیوں رکھا تھا اُس نے ہاتھ؟"۔ اُس کے بال مٹھی میں سے کماس نے جھنجھوڑ دیئے۔

"باپ رے"۔ وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔ "اب سے یہ حال ہے۔ آگے جانے کیا کیا ہو؟"۔

ادرشائی کو اُس کے لب و لہجے پر ہنسی آگئی۔

"پھر آپ نے اُسے گھر بھی ڈراپ کیا تھا"۔ وہ پھر بولی۔

"خاصی چوکیدار طبیعت پائی ہے"۔ وہ شرارت سے بولا "میں نے اُس سے معذرت کر لی تھی۔ اکیلی لڑکی کو لفٹ دینا میرا اصول نہیں"۔

ادرشائی کو ہنسی آگئی۔

"تمہیں اگر لفٹ دی تھی۔ تو تم مجھے اچھی لگتی تھیں۔ نہ اُس سے پہلے یہ کام کیا ہے۔ نہ آئندہ ایسا ارادہ ہے۔ آؤ اب پیار کریں"۔ وہ اُسے زور سے لپٹاتے ہوئے شرارت سے بولا۔ ادرشائی کی سانسیں پھر اُلجھنے لگیں۔

"ایک بات بتاؤ"۔ قدرے توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولا۔

"کیا؟"

"سچ سچ کہو گی؟"۔

"ہاں"۔

"میں اچھا لگتا ہوں؟"۔

"نہیں"۔ اُس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"اپنا منگیتر؟"

"وہ بھی نہیں"۔

"پھر؟"۔ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"بتاؤں؟"۔ اُس نے بڑی ہمت کی۔

"ہاں"۔

مگر اُس کی معنی خیز نظروں سے نظریں ملتے ہی اُس کی پلکیں ایک بار پھر جھک گئیں۔ اتنی بڑی بات۔ بالکل براہِ راست۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"بتاؤ نا"۔ اُس نے اصرار کیا۔

"بس ایک آدمی اچھا لگتا ہے"۔ اُس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے اُس نے شرماتے شرماتے کہہ دیا۔

"کون ہے وہ آدمی؟"۔ اُسے بازوؤں میں بھر کر اُس نے پھر بھینچ لیا۔

"یہی تو ہے"۔ اُس کے سینے میں ہنوز منہ چھپائے اُس نے دھیرے سے کہا

"نام نہیں آتا؟"

"لوفر"۔ اور ساتھ ہی زبردست کھنکھار ہوئی۔

شازی چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

کامران نے اُس طرف دیکھا۔ نعیم اُن کی طرف مکمل پیٹھ کیے اب بھی کھڑا تھا۔

"اب آ ہی گئے ہو تو بیٹھ ہی جاؤ"۔ کامران پہلے لفظ "لوفر" اور پھر نعیم پیٹھ کر کے کھڑے ہونے پہ ہنسے بنا نہ رہ سکا۔

"آداب بھابی"۔ وہ فوراً رخ اُن کی طرف کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔
"دیکھو نعیم! بھابی" تم نے کہا ہے۔ اب روٹھ گئی تو منانا تمہارے
ذمے"۔ وہ سنبھلتے ہوئے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔
"تو کیا تمہارا بھی ایسا کوئی ارادہ تھا کہنے کا؟" نعیم سنجیدگی سے بولا۔
اور پھر کامران کے ساتھ ساتھ نعیم بھی قہقہہ لگا اُٹھا۔
شائی شرم سے سُرخ ہوئی جا رہی تھی۔
"بھابی! آپ کو کیا معلوم ہم دونوں پہ کیا بیتی؟ جب آپ نے لکھ بھیجا۔
کہ آپ اس منگنی پہ قائم نہیں رہ سکتیں"۔
شائی کا سر مزید جھک گیا۔
"نعیم پلیز۔۔۔"
"اوجاہے۔ میری اپنی بھابی ہیں۔ تمہیں کیا مجھ سے زیادہ پیاری ہیں"۔
کامران جز بز ہو کر رہ گیا۔
"شائی تم مائنڈ نہ کرنا۔ اس کی عادت ہے۔"
شائی نے جھجکتے جھجکتے ایک نظر نعیم کو دیکھا۔ اور پھر سر واپس جھکا لیا۔
"بھابی! یہ آپ سے بہت ڈرتا ہے"۔
اور کامران نے اُسے مکا تان کر دکھایا۔
"مُکا کیوں دکھاتے ہو"۔ وہ لاپرواہی سے بولا "ویسے بھابی آپ کو پیار
بھی بہت کرتا ہے۔ جب سے آپ کو دیکھا تھا اس نے۔ ساری ساری رات
جاگتا رہتا تھا۔ ہر وقت بھاگا آتا تھا۔ کہتا تھا" کچھ کرو نعیم ورنہ مر جاؤں گا"۔

"بس کرو۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"۔

"تو تم انہیں پیار نہیں کرتے؟"

کامران سٹ پٹا کر چپ ہو رہا۔

"نہیں کرتے؟"۔ وہ جیسے دھمکی دینے کے انداز میں بولا۔

"کرتا ہوں۔۔۔"۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"پھر کر کے دکھاؤ"۔ وہ شرارت سے باز نہیں آ رہا تھا۔

"تم جاؤ پہلے"۔

"تو میں دیوار کی طرف منہ کر لیتا ہوں"۔ اُس نے سچ مچ رُخ دیوار کی طرف کر لیا۔

"اوں ہونہہ۔ ایسے کام نہیں چلے گا"۔

"تو ضرور چلا جاؤں؟"۔ دیوار کی طرف رُخ کیے نعیم بولا۔

"ہاں"۔

"تو جاتا ہوں۔ لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ۔۔" وہ باقاعدہ مارچ کرتا ہوا چل دیا۔

"آؤ تمہیں پیار کروں"۔ اُس کا جھکا سر سینے سے لگاتے ہوئے وہ شرارت سے بولا۔

———

پورچ میں کھڑی وہ اپنی خوبصورت سپورٹس کار کی طرف بڑھی۔مگر ......دوسرے ہی لمحے وہاں کھڑے دو اجنبی گارڈز کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر......وہ پیچھے ہٹ آئی۔احساس ندامت سے اُداس چہرے پر زردی کھنڈ آئی۔محرومیت کے خیال سے خوبصورت آنکھوں میں کرب اُتر آیا۔

◎ معاً......وہ مرغیوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونکی۔مڑ کر دیکھا۔ایک کے بعد دوسری۔مرغیاں بڑے مزے سے وین سے نیچے کود رہی تھیں۔ اُس نے فوراً گاڑی روک لی۔ نیچے اُتر آئی ”کہاں جا رہی ہو؟“۔ وہی آدمی تھا اُس شام والا جسے پھپھو نے اُسے لینے ایئرپورٹ بھیجا تھا۔

”پولٹری دینے“۔”کون باقی رہتا ہے؟“”مالک باقی رہتا ہے“۔

”لائسنس بھی ہے تمہارے پاس؟“

”کیوں“؟

”مالک کے یہاں جاؤ گی تو وہ لائسنس دیکھے بغیر گھسنے دے گا؟“

◎ تصور ہی تصور میں اُس نے اُسے اپنے پیار کے اظہار پر بچوں کی طرح تالیاں پیٹتے دیکھا تھا۔ کئی بار پولیس سٹیشن فون کرنے دوڑتے دیکھا تھا۔

◎ باہر شام کے سائے سلگنے ہو رہے تھے۔ نیچے جزیرے پر کئی بتیاں جگ مگ کرنے لگی تھیں۔ جہاز اپنے منزل مقصود کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔

ایک خوابناک جزیرے میں پروان چڑھتی محبت کی خوبصورت داستان 'اک لڑکی چھوٹی سی' آمنہ اقبال احمد کی منفرد طرز تحریر میں ایک اور حسین اضافہ ہے۔

ملنے کا پتہ:

ایس ٹی پرنٹرز' گوالمنڈی راولپنڈی۔ فون نمبر: 5772818

سعید بک بینک' جناح سپر اسلام آباد۔ 2651656

سعید بک بینک' 28۔ ارباب روڈ پشاور کینٹ فون: 273761